ماہنامہ

گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

Reg: CPL No. 80

OCTOBER 2007

اکتوبر
2007

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

محبت

اللہ

صداقت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔

☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔

☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔

☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً

وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ط

الاعراف ۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے

ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح وشام

یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

ماہنامہ
آدمیت فلاح
گوجرانوالہ
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار
خواجہ عبدالحکیم انصاری رح
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 11 شمارہ 1 اکتوبر 2007ء رمضان 1428ھ

ایڈیٹر
وحید احمد

مجلس ادارت

محمد مرتضیٰ توحیدی، ایم محمد اکرم، پروفیسر منیر احمد لودھی، ایم محمد طالب ڈاکٹر عبدالرشید وقار، محمد صدیق، سید عاشق حسنین مرتضیٰ شاہ بخاری مولانا حافظ بشیر احمد

قیمت ———— -/20 روپے　　سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

اسباب نہیں مسبب پر بھروسہ

اسباب کی دنیا میں اسباب کے اندر سے اللہ کے ہاتھ کو دیکھ لینا، محسوس کر لینا اور اس کا ایمان و یقین پیدا کر لینا ہی دراصل توحید ہے۔ مزید ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ پر یقین ہو گیا تو اس کے رسول ﷺ پر بھی جان نثار کرنا سیکھ لو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یایها الذین امنوا استجیبوالله وللرسول اذادعاکم لما یحییکم و اعلموا ان الله یحول بین المرء و قلبه٥

''اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے''۔ (الانفال:24)

شہ رگ تو بہت دور ہے اے جانِ تمنا
آ میرے قریب اور قریب اور قریب اور

عذابِ الٰہی کے مستحق لوگ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وانه الیه تحشرون٥ واتقوا فتنةً لا تصیبن الذین ظلموا منکم خآصة واعلموا ان الله شدید العقاب٥

''اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے''۔ (الاعراف:24-25)

ایک برائی جب عام ہونے لگتی ہے تو لوگ اسے روکتے نہیں بلکہ ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔لیکن جب یہ آگ اُن کے اپنے گھر تک پہنچتی ہے تو پتا چلتا ہے۔ جب عام عذاب آتا ہے تو پھر کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔

خصوصی انعامات اور ان کے حصول کا طریقہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

واذکروا اذا انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاوکم وایدکم بنصرہ ورزقکم من الطیبت لعلکم تشکرونo

یایھا الذین امنوا لا تخونوا اللّٰہ والرسول وتخونوا امنتکم وانتم تعلمونo

واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ وان اللّٰہ عندہ اجرعظیمo یایھا الذین امنوا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقاناً ویکفرعنکم سیاتکم و یغفرلکم ۔ واللّٰہ ذوالفضل العظیمo

''یاد کرو وہ وقت جب تم تعداد میں بہت کم تھے اور زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا،تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹانہ دیں۔پھر اللہ نے تمہیں جائے پناہ مہیا کر دی۔اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے۔تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔اے ایمان والو: جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کیلئے بہت کچھ ہے۔اے ایمان والو!اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمہارے قصور معاف کر دے گا،اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے''۔

(الانفال:26-29)

یعنی اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو تین چیزیں عطا فرمائے گا۔

نیک و بد کی تمیز۔

پھر برائیوں کو دور کر دے گا۔

اور پھر مغفرت فرما دے گا۔

اس کے بعد کفار کی مکارانہ کاروائیوں کے ذکر اور نبی کریم ﷺ کو ان سے محفوظ رکھے جانے کا ذکر فرما دیا اور مومنوں کو عبرت کے طور پر ابو جہل کا ایک مقولہ بھی سنایا۔ روایات میں ہے کہ جب ابو جہل لشکر لے کر مدینہ کی جانب نکلنے لگا تو عین آخری لمحات میں اس نے اپنی جذباتی وابستگی اور والہانہ اندازِ حقانیت ظاہر کرنے کے لئے کفار کے گروہ کی موجودگی میں بیت اللہ کے پردے کے ساتھ لپٹ کر یہ دعا کی۔

واذ قالو اللھم ان کان ھذا ھوالحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء اوئتنا بعذاب الیمo

''اور جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور تکلیف دینے والا عذاب بھیج''۔ (الانفال:32)

یہ دُعا کفارِ مکہ اس وقت بھی کیا کرتے تھی جب آپ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے مگر اس وقت تو عذاب نہ اُترا اور اُترتا بھی کیسے؟

<u>نزولِ عذاب کیوں نہیں ہوا؟</u>

اس کے بعد کی آیت میں اس کی وجہ ذکر کی گئی ہے نیز قانونِ الٰہی بھی ہے:

وماکان اللّٰہ لیعذبھم وانت فیھم وماکان اللّٰہ معذبھم وھم یستغفرونo (الانفال:33)

''اللہ تعالیٰ انہیں (اس وقت تک) ہرگز عذاب نہ دیتا جب تک کہ آپ ان میں تھے اور نہ ہی انہیں اس وقت تک عذاب سے ہمکنار کرے گا جب تک کہ وہ بخشش مانگتے رہیں گے''۔

گویا صراحت کر دی کہ اگر کسی قوم کے اندر نبی زندہ موجود ہو تو اس قوم کو ہلاک نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اُس پر عذاب اُتارا جاتا ہے اور اگر کسی قوم کو ہلاک و برباد کرنا مقصود ہو تو نبی وقت کو اس

قوم سے الگ نکال دیا جاتا ہے۔دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ اگر کوئی قوم اپنی غلطیوں پر نادم ہوکر توبہ کرے، اللہ سے بخشش مانگے تو بھی اللہ تعالیٰ اس قوم کو عذاب سے بچا لیتے ہیں۔قوم یونس کا ذکر آئندہ اس سلسلے میں ہوگا۔

نزولِ عذاب کا ایک سبب

عذاب سے بچاؤ کے ذکر کے بعد عذاب کے نزول کے ایک سبب کو یوں بیان فرمایا:

ومالهم الا يعذبهم الله وهم يصدون عن المسجد الحرام وماكانوا اولياء ه۔ ان اولياؤه الا المتقون ولكن اكثرهم لايعلمونo

وما كان صلاتهم عند البيت الا مكاءً وتصدية فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرونo

ان الذين كفروا ينفقون اموالهم ليصدوا عن سبيل الله فسينفقونها ثم تكون عليهم حسرةً ثم يغلبون۔ والذين كفروا الى جهنم يحشرونo

''اور (اب) ان کیلئے کونسی وجہ ہے کہ وہ (اللہ) انہیں عذاب نہ دے جبکہ وہ مسجدِ حرام (میں نماز پڑھنے) سے روکتے ہیں اور وہ اس مسجد کے متولی بھی نہیں۔اس کے متولی تو صرف متقی (لوگ) ہیں لیکن اُن میں سے اکثر نہیں جانتے اور ان (کافر) لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے قریب سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے علاوہ کچھ نہ تھی۔تو تم جو کفر کرتے تھے، اب اس کے بدلے عذاب (کا مزہ) چکھو۔جو لوگ کافر ہیں، اپنا مال خرچ کرتے ہیں کہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں۔سو ابھی اور خرچ کریں گے مگر انجام کار یہ (خرچ) ان کیلئے حسرت (اور افسوس) کا سبب ہوگا اور وہ مغلوب ہوجائیں گے''۔ (الانفال:34-35)

زیرِ نظر آیت کریمہ میں نزولِ عذاب کے اسباب کا واضح ذکر ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

1۔ مسجد حرام یا دیگر مساجد میں داخلے کو ناممکن بنانے کی کوشش کرنا خواہ اس کا سبب گروہ بندی ہو یا علاقائی تعصب یا مسلک پرستی (ہمارے ہاں مساجد کو بعض لوگوں نے الگ الگ فرقوں کیلئے اس طرح سے مخصوص کرلیا ہے کہ دوسرے فرقے کے لوگ اس میں جا ہی نہیں سکتے بلکہ کچھ عرصہ تک تو یہ کیفیت تھی کہ مسجد میں اگر غیر فرقہ کے لوگ داخل ہو جاتے تو ان کے جانے کے بعد مسجد کو دھویا جاتا تھا)

2۔ مسجدوں کی ولایت یا مسجدوں کی نگرانی متقی اور اللہ سے ڈرنے والوں کے علاوہ کسی اور کے سپرد ہو۔

3۔ مسجد کا احترام کرنے کی بجائے مسجد کے قرب میں سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا یا مسجد کے اندر بلند آواز سے گفتگو اور شور وشغب عام ہوجائے جس سے ذکر الٰہی میں خلل پیدا ہو۔ (آج ہم بھی اپنے بارے میں غور کریں کہ نمازوں کے اوقات میں مسجدوں کے قرب وجوار میں بلند آواز سے گانا بجانا، ریکارڈنگ اور شوروغوغا ہوتا رہتا ہے)

4۔ اگر اپنے مال کو اللہ کی راہ کے علاوہ اس نیت سے خرچ کیا جائے کہ لوگ راہِ ہدایت سے رُک جائیں۔ یقیناً یہ خرچ قیامت کے روز ان کیلئے حسرت و افسوس کا باعث بنے گا اور دنیا میں بھی باعث عذاب ہوگا۔

آداب جہاد

اس تذکرہ کے بعد سورہ انفال کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔اس حصے میں سب سے پہلے آداب جہاد و قتال کا ذکر آتا ہے۔اس میں صراحت ہے کہ یہ جہاد جو اسلام نے فرض قرار دیا ہے، یہ عام جنگوں کی طرح نہیں جن میں علاقے فتح کئے جاتے ہیں اور قتل و غارت گری دستورِ زمانہ ٹھہرتی ہے بلکہ یہ عبادت ہے اور عبادت اسی طریقے سے کی جانی چاہیئے جیسا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔اس لئے فرمایا کہ جب تم جہاد پر نکلو تو پھر ثابت قدم رہو اور ہر دم اللہ کا ذکر کرتے رہو۔اس لئے کہ یہ جنگ ذاتی منفعت کیلئے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری انسانیت کو ظلم سے آزاد کراؤ۔ جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے، وہاں تم

ظلم کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینہ اُو آرمید

جہاد کے کچھ آداب ہیں۔یعنی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے آگے بڑھنا، جنگ کے دوران میں بھی کوئی کام ایسا نہ کرنا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے برعکس ہو اور پھر جنگ کے دوران میں اعصاب کو مضبوط رکھتے ہوئے صبر کرنا اور صبر بھی ایسا کہ اپنے ساتھیوں میں بھی اختلاف کی صورت میں لڑائی جھگڑے سے مکمل پرہیز کیا جائے اور پھر گھر سے نکلتے ہوئے کسی شیخی یا اکڑفوں کے ساتھ نہیں بلکہ انتہائی تواضع، اللہ کی عبادت اور اس کے دین کو پھیلانے کی نیت رکھتے ہوئے روانہ ہونا چاہئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

یایھا الذین امنوا اذا لقیتم فئةً فاثبتوا واذکروا اللّٰہ کثیراً لعلکم تفلحونo

واطیعوا اللّٰہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللّٰہ مع الصبرینo

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرًا ورئآء الناس و یصدون عن سبیل اللّٰہ۔

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد

کرو۔ توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا مت کرو، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھر سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلتے ہیں اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ (الانفال 45-47)

ان بنیادی آداب کو بیان کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیشہ کیلئے تمام انسانیت کیلئے ایک قاعدہ مقرر کردیا۔

بقول مولانا ظفر علی خانؒ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ذلك بان اللّٰه لم يك مغيرًا نعمة انعمها على قوم حتى يغير وا ما بانفسهم وان الله سميع عليمo

''یہ اللہ کے اس طریقے کے مطابق ہے کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو بدلنے کا اہتمام نہیں کر لیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے''۔ (الانفال :53)

جدید ترین ٹیکنالوجی کا حصول حکمِ الٰہی ہے

اس کے بعد ایک انتہائی اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ اے کاش! اس دور میں ہماری توجہ اس طرف ہو جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوا لله وعدوكمo

''تیاری کرو! جتنی بھی کی جا سکتی ہے قوت حاصل کرنے کیلئے اور ہر وقت گھوڑوں کو تیار باندھے رکھوتا کہ تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرائے رکھو''۔ (الانفال:60)

جنگ کی ہمہ وقت اتنی تیاری رکھو کہ کوئی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہ کر سکے۔ مزید فرمایا کہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں جانتا ہے، ان کیلئے بھی تمہیں تیار کرنا پڑے گا۔

دین و دنیا اکٹھے رکھنا

یہاں قوت کے حصول سے مراد جدید ترین ٹیکنالوجی کا حصول ہے۔ اس میں ہمیں اپنے دور کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنا پڑے گی۔ یہ تو ہمارے لئے اللہ کی طرف سے قرآنِ مجید میں فرض کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی علوم کا حصول ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہو گیا۔ اور وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دینی کتب کی تیاری سے کام بن جائے گا۔ وہ بھی غلط ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیوی علوم سے کام بن جائے گا، وہ بھی غلطی پر ہیں۔ دونوں کے حسین امتزاج ہی سے کام چلے گا۔ ان کو باہم یک جان کرنے سے کام بنے گا۔ اس کے بغیر تیاری ممکن نہیں لیکن سائنسی علوم کے حصول سے قبل اچھا مسلمان اور اچھا انسان بننا ضروری ہے۔ اس لئے ایسی طرزِ تعلیم کی ضرورت ہے جس میں دینی، روحانی اور دنیوی علوم خوبصورت توازن کے ساتھ یک جان ہو چکی ہوں۔ اس کے بغیر اس آیت پر عمل ممکن نہیں۔ اسی لئے اس آیتِ کریمہ کے بعد قتال اور صلح کے خصوصی احکام کا تذکرہ ہوا کہ ہم بہترین انسان کی حیثیت سے ایک عملی نمونہ بن کر پیش ہو سکیں۔ یہاں یہ بھی ذکر ہے کہ قتال کی فرضیت اور جنگی قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک نیز دارالحرب میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے کیا مراعات ہیں؟ ان کے ساتھ کس حد تک تعاون کیا جا سکتا ہے؟

لیلۃ القدر

(امتیاز احمد)

اللہ تعالیٰ سورۃ القدر کی آیات نمبر ۱ سے ۵ میں ارشاد فرماتا ہے۔

انا انزلنه فی لیلة القدر o وما ادرك ما لیلة القدر o لیلة القدر خیر من الف شهر o تنزل الملئِکة والروح فیها باءِ ذن ربهم من کل امر o سلم هی حتی مطلع الفجرo

(ترجمہ) ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا، اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے، اس میں روح (الامین) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام کے) لئے اپنے پروردگار کے حکم سے اُترتے ہیں، یہ (رات) طلوع صبح تک (امان اور) سلامتی ہے۔

اس سورۃ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم موقع کی مناسبت سے تئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا بذریعہ وحی حضور ﷺ پر نازل فرمایا۔ لیکن اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ یہ کیوں فرماتا ہے، کہ ہم نے یہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ لوح محفوظ سے پہلے آسمان دنیا پر لائے پھر آسمان دنیا سے رفتہ رفتہ تئیس سال حضور ﷺ کے قلب مبارک پر نازل فرمایا، اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ پہلی وحی جو حضور ﷺ پر غار حرا میں نازل کی گئی تھی اسی مبارک رات یعنی لیلۃ القدر میں نازل کی گئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، چونکہ سورۃ العلق کی پہلی چند آیتیں پہلی وحی تھی اور قرآن پاک میں سورۃ لیلۃ القدر، سورۃ العلق کے فوراً بعد ہے۔ اس لئے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ لیلۃ القدر میں وحی کا آغاز ہوا۔

لفظ ''قدر'' کا مطلب کیا ہے؟۔ اس کے تین معانی ہیں۔ قدر کے معنی قیمتی ہے۔ سوچئے، اس

رات کو قیمتی کس چیز نے بنایا؟ یقیناً قرآن حکیم کے نزول نے ،قدر کے دوسرے معنی طاقتور ہیں۔ پس ایک شخص جس کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اس رات کے دوران مخلصانہ عبادت سے روحانی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔

لفظ ''قدر'' کے تیسرے معنی تقدیر کے بھی ہوتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہر قسم کا قطعی اور آخری فیصلہ انسانوں کی پیدائش کے بہت پہلے ہی نافذ کر چکا ہوتا ہے،لیکن پروردگار اس رات کو آنے والے پورے سال کے تمام واقعات کو جاری و صاری کرنے کے احکامات کو فرشتوں کے سپرد فرما دیتا ہے۔علماء دین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ،سورۃالدخان کی چند ابتدائی آیات اِسی رات (شب قدر) کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ سورۃ الدخان کی آیات نمبر ا سے ۴ تک میں فرماتا ہے۔

حم oوالکتب المبین o انا انزلنہ فی لیلۃ مبرکۃ انا کنا منذرینo فیھا یفرق کل امر حکیمo

(ترجمہ)حم۔اس کتاب روشن کی قسم۔کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں۔اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کئے جاتے ہیں۔

بہت کم علماء دین کا یہ خیال ہے کہ سورۃ الدخان کی یہ آیات نصف شعبان کی رات کی طرف اشارہ کرتی ہیں،ان علماء کا بھی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہم فیصلے شعبان کے دوران کر لیتے ہیں،اور اللہ تعالیٰ یہ فیصلے لیلۃ القدر میں فرشتوں کے سپرد فرماتا ہے۔اصل حقیقت کیا ہے؟اس کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''یہ ایک رات ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے''۔اس کا کیا مطلب ہے؟اس زمانے کے اہل عرب ایک ہزار کو بہت بڑی تعداد تصور کرتے تھے۔یعنی اس ایک رات کی عبادت گویا ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر اور افضل ہے۔(ایک ہزار مہینوں کے تیراسی

سال، اور چار ماہ ہوتے ہیں)۔

ابن ابی حاتم نے مجاہدؒ کے حوالے سے روایت کی ہے، کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ایک یہودی کے بارے میں بتایا، جو مسلسل اسّی برس تک بلا ناغہ اللہ کی عبادت کیا کرتا رہا۔ اس طرح ابن جریر نے مجاہد کے حوالے سے روایت کی ہے، کہ آپ ﷺ نے فرمایا ایک یہودی نے اسّی سال تک بلا ناغہ پوری رات اللہ کی عبادت کی، اور پورا دن اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسول ﷺ کی اُمت کو یہ بتا رہا ہے کہ اس یہودی کی اسّی سال کی عبادت اور جہاد کے مقابلہ میں امت مسلمہ کی ایک رات (لیلۃ القدر) کی عبادت زیادہ افضل ہے۔ اس لئے لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت محمدی کے لئے خاص الخاص انعام ہے۔ یہ خاص انعام اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے آخری رسول ﷺ اور ان کی اس امت کو کس درجہ محبت ہے۔ علاوہ ازیں کو ہم سے پہلے امتوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ اور ان کی امت کو پہلی امتوں پر فوقیت دیتے ہوئے رمضان المبارک کے دوران لیلۃ القدر مقرر کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔

اس مبارک رات کے دوران جبریل علیہ السلام کے علاوہ اور بہت سارے فرشتے جو ہمہ وقت "سدرۃ المنتہیٰ" پر حاضر رہتے ہیں، آسمان دنیا تک آکر جب اللہ کے بندوں کو عبادت میں مصروف دیکھتے ہیں، تو اللہ سے ان کی حق میں سفارش کرتے ہیں۔ یہ رات مکمل امن وسکون کی رات ہوتی ہے۔ اس رات میں برکتوں کا نزول صبح صادق نمودار ہونے تک جاری رہتا ہے! کچھ لوگ اس پاک رات کے دوران کچھ عجیب وغریب مناظر دیکھتے ہیں۔ اور جو لوگ ان عجائبات کا مشاہدہ نہیں کر پاتے، وہ لوگ بھی اس رات کی برکتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ رات کب آتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سوۃ البقرہ: 185

شھر رمضان الذی انزل فیہ القران

(ترجمہ) رمضان کا مہینہ (ہے) جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا۔

اللہ تعالیٰ سورۃ القدر کی آیت نمبر 1 میں بھی فرماتا ہے:

انا انزلنه فی لیلة القدرo

(ترجمہ) ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

لہٰذا شب قدر رمضان المبارک کی ایک رات ہے ۔اس بارے میں حضورﷺ کی کئی احادیث موجود ہیں ۔بخاریؒ میں ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو۔اسی طرح مسلم میں ابن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا۔کہ شب قدر رمضان کی ۲۷ویں شب کو ہی واقع ہوتی ہے۔ایسا یقینی طور پر نہیں ہے ۔بلکہ اس رات کو آخری عشرہ میں تلاش کرنے کا حکم دیکر اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک بہت خاص مہربانی کی ہے ۔کہ ہم ان دس راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادات میں مشغول رہ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔

کچھ لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ قرآن کریم رات کو نازل کیوں ہوا؟ دن کو نازل کیوں نہیں ہوا؟ اسکی اصل وجہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ہم انسان اپنی عقل وفہم کی بنیاد پر یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ رات کو دن کی نسبت زیادہ سکون اور سناٹا ہوتا ہے ۔لہٰذا رات کے وقت انسانی دماغ کسی بھی خیال کو جذب کرنے کی زیادہ طاقت وصلاحیت رکھتا ہے ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔سورۃ مزمل:6

ان ناشئة الیل هی اشد وطاواقوم قیلاo

(ترجمہ) بے شک رات کو اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر ہے اور (قرآن) پڑھنے کے لئے بہت ہی خوب وقت ہے۔

یعنی دن کی نسبت رات کو الفاظ زیادہ موثر ہوتے ہیں ۔اور ذکر زیادہ درست ہوتا ہے ۔فلسفہ

کے نقطۂ نظر سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ رات کے معنی تاریکی خالی پن (خلاء) کھوکھلا پن کسی بھی چیز کا قطعی طور پر لاموجود ہونا ہوتا ہے۔اس کیفیت کے بعد جب دن طلوع ہوتا ہے تو روشنی ہر چیز کی حقیقت کو واضح کر دیتی ہے۔جب قرآن کا نزول ہوا، تو پورا عالم انسانیت تاریکی میں تھا۔قرآن نے اس تاریکی کو ہدایت کی روشنی سے منور کر دیا۔اس روشنی نے حق و باطل کے درمیان فرق بتا دیا۔سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۸۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هدى للناس وبينت من الهدى والفرقان

(ترجمہ) جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنیوالا ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے، کہ یہ ہدایت یا روشنی صرف اہل عرب، یا صرف مسلمانوں کیلئے نہیں ہے، بلکہ پورے عالم انسانیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔انسان کو عطا کی گئی اللہ کی تمام تر عنایات میں سب سے عظیم عنایت یہی ہدایت کی روشنی ہے۔جو پوری انسانیت کو تاریکی سے نکال کر روشنی عطا کرتی ہے۔ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت فرمایا ''اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں تو مجھے کیا کرنا چاہئے''؟ اللہ کے رسول ﷺ نے جواب میں فرمایا: یہ دعا مانگو۔

''اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عنا''

ترجمہ: ''اے اللہ یقیناً آپ معاف فرمانے والے ہیں۔آپ کو معاف فرما دینا بہت پسند ہے لہٰذا اے اللہ ہم سب کے گناہوں کو بھی معاف فرما دیں''۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس ادنیٰ کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، اور مجھے اور اس کو پڑھنے اور سننے والوں کو نیک ہدایت دے، اور ہم سب کے تمام گناہوں کو معاف فرمائے (آمین)۔

صدائے فقیر

اغیار کی دوستی اور قرآن

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

اس وقت دنیا میں کروڑوں کتابیں موجود ہیں لیکن کسی مصنف نے اپنی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے مندرجات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہیں ۔یہ اعجاز اور اعزاز صرف اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب قرآن مجید کو حاصل ہے کہ اس کی ابتدا ہی اس اعلان سے ہوتی ہے کہ شکوک وشبہات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے ۔اور یہ ازلی ، ابدی اور اٹل حقائق پر مشتمل ہے ۔اہل ایمان اس عظیم کتاب کے ایک ایک لفظ پر صدقِ دل سے ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں ۔اس کتاب کا ایک معجزاتی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں دی ہوئی پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوتی ہے ۔ایسا کیوں نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی اور ماضی و مستقبل کی جکڑ بندیوں سے وراء الورا ہے ۔اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر یقین کامل رکھتے ہیں ۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ابھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہیں فرمائی تھی اور کفار کی طرف سے اہل ایمان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ جا رہے تھے ۔اسی دوران میں دنیا کی دو عظیم طاقتوں روم اور ایران میں جنگ جاری تھی ۔بت پرست مشرکین مکہ کی ہمدردیاں آتش پرست ایرانیوں کے ساتھ تھیں ۔ اور مسلمان اپنی فطرت کے مطابق اس وقت بھی اہل کتاب رومیوں کے غلبہ کے خواہاں تھے ۔اس جنگ میں ایرانیوں نے رومیوں کو بہت بری طرح سے شکست دے دی تو کفار مکہ بہت خوش ہوئے اور اسے اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست پر محمول کیا ۔انہی ایام میں قرآن کریم کی سورت الروم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل روم اس مغلوبیت کے چند برس بعد ہی ایرانیوں پر غالب آجائیں گے ۔اس وقت رومیوں کو اس انداز سے شکست ہوئی تھی کہ مادی نکتہ نظر سے ان کی دوبارہ فتحیابی ناممکن دکھائی دیتی تھی ۔لیکن اہل ایمان اپنے رب کے قول کو اٹل جانتے ہوئے اس پیشگوئی پر خوش ہو گئے ۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایمان کی یہ

کیفیت تھی کہ انہوں نے قریش کے ایک ممتاز سردار اُبی بن خلف سے شرط لگالی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب نہ آئے تو میں دس اونٹ دونگا اور اگر غالب آ گئے تو تم دس اونٹ مجھے دینا۔ جب آنحضرت ﷺ کو اس شرط کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت میں "بِضعِ سِنِین" آیا ہے اور اس کا اطلاق تین سے نو سال کی مدت تک ہوتا ہے لہٰذا تم اس شرط کی مدت نو سال تک مقرر کر کے اونٹوں کی تعداد بڑھالو۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اُبی بن خلف سے نو سال کی مدت مقرر کر کے سو اونٹوں کی شرط لگالی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے عین مطابق قیصر روم نے اپنی شکست سے ٹھیک سات سال بعد ایرانی فوجوں کو شکست فاش دے دی۔ اہل ایمان کو یہ خوشخبری اس وقت ملی جب اللہ کی نصرت سے وہ میدان بدر میں کفار مکہ کو شکست دے چکے تھے۔ اسطرح مسلمانوں کو دوہری خوشی نصیب ہوئی۔

جب تک اہل ایمان رب العالمین کے ارشادات اور حضور رحمۃ اللعلمینؐ کے فرمودات کو مرز جان بنا کر بنی نوع انسان کو ہر نوع غلامی سے نجات دلانے اور دنیوی و اخروی نعمتوں سے مالا مال کر دینے والے اللہ کی حاکمیت والے سچے دین کے علمبردار بن کر مجاہدانہ زندگی بسر کرتے رہے انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل رہی اور فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی رہی۔ جب اُمت مسلمہ کا عقیدۂ توحید کمزور ہو گیا اور وہ دنیوی لذات میں گرفتار ہو کر امت وسطی کے کردار کو فراموش کر بیٹھی تو اسے سزا کے طور پر اغیار کی غلامی میں مبتلا کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس ابتلا کا ایک دور ختم ہوا اور مسلمان ممالک کو سیاسی آزادی نصیب ہوئی لیکن ہم نے اس روش کو پوری طرح بدلنے کی کوشش نہیں کی جس کی پاداش میں اقوام عالم کی قیادت ہم سے سلب کر لی گئی تھی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قوت و نصرت پر بھروسہ کرنے کی بجائے اللہ کے دشمنوں اور اپنے سابق آقاؤں کو ہی اپنا سرپرست، دوست اور ہمدرد بنائے رکھنے کی کوتاہی کی اور اللہ کی طرف سے اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔ قرآن کریم جو ہمارا آئین حیات ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے ہماری خارجہ پالیسی کی بنادیں بڑی وضاحت کے ساتھ متعین کر رکھی ہیں۔ ہم یہاں متعلقہ آیات کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں تا کہ ان کی روشنی میں

اپنے قومی کردار کا جائزہ لے کر جادہ حق پر گامزان ہوسکیں:۔

''جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو اللہ اور اسکے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں''۔(22-58)

''اے اہل ایمان ان لوگوں سے جن پر اللہ غصے ہوا ہے (یعنی یہود و نصاری سے) دوستی نہ کرو۔ یہ لوگ بھی آخرت کی زندگی سے اسی طرح ناامید ہوگئے ہیں جس طرح کافر قبروں میں مردوں کے جی اُٹھنے سے ناامید ہیں''۔ (13:60)

''اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں ان کو اور کفار کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنادیا ہے دوست نہ بناؤ۔اور مومن ہو تو اللہ ہی سے ڈرو''۔(75:5)

''اے ایمان والو! اغیار کو اپنا رازدان نہ بنانا۔یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور ہر اس امر کی خواہش کرتے ہیں جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔کچھ دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہوچکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے وہ کہیں زیادہ ہے۔ہم نے تمہارے لئے علامات واضح طور پر بیان کردی ہیں اگر تم عقل سے کام لو''(118:3)

''اے ہمارے رسول ﷺ آپ دیکھیں گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ عداوت رکھنے والے یہودی اور مشرکین ہیں''(82:5)

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔یہ باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے شمار ہوگا۔بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''(51:5)

''یہ خوف دلانے والا تو شیطان ہے جو تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا''(175:3)

''تمہارے خیر خواہ اور دوست تو اللہ تعالیٰ ،اسکا رسول ﷺ اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور اطاعت میں جھکے رہتے ہیں۔جو اللہ تعالیٰ ،اسکے رسولؐ اور اہل ایمان

سے دوستی کرے گا وہ گویا اللہ کے لشکر میں شامل ہوگیا اور اللہ کا لشکر ہی غلبہ پانے والا ہے۔"
(56-55:5) آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس قدر واضح الفاظ میں یہود و ہنود و نصاریٰ کی نفسیات بیان کر کے ہمارے لئے ایک محفوظ حکمت عملی طے فرما دی۔اس کے باوجود بھی اگر ہمارے حکام اللہ تعالیٰ کے صاف صاف احکام کے علی الرغم ان اقوام کی دوستی کے وہم میں مبتلا ہو جائیں تو نتیجہ تو یقینی طور پر وہی نکلے گا جس کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے کر رکھی ہے۔بار بار اغیار کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کے باوجود ہمارے دانشور، صحافی اور سیاستدان ان چہیتوں کی دوستی کا دم بھرنے سے باز نہیں آتے۔اور ساتھ ساتھ ان اصنام باطل کی بے وفائیوں کا شکوہ بھی کرتے رہتے ہیں تاکہ کسی طرح ان کی نظر التفات حاصل ہو جائے۔ان کی فریب کاریوں کے باعث رنج پر رنج اٹھاتے چلے جا رہے ہیں پھر بھی ان کی دوستی کے جال سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔حالانکہ سچا مسلمان اب بھی شرطیہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہود، ہنود اور عیسائی کبھی ہمارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔آزماتا تو اسے چاہیے جس کے بارے میں علم اور تجربہ نہ ہو۔ہمیں تو ہمارے علیم و خبیر پروردگار نے ان کے خبث باطن سے بھی آگاہ فرما دیا ہے اس لئے ان اقوام کے ساتھ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے فرمودات کی روشنی میں ہی طے کرنے چاہئیں تاکہ ان کے شر سے اور اللہ کی ناراضگی سے بچ جائیں۔مسلمانوں سے ازلی بیر رکھنے والے ان گروہوں کے علاوہ دوسری غیر مسلم اقوام سے تعلقات رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی کیلئے ارشاد فرمایا۔

"جن لوگوں نے تم سے دین کے اختلاف کی وجہ سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں فرماتا۔اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کے ساتھ تم کو دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی پشت پناہی کی۔جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں"۔ (8:60)

قرآنِ کریم کی ان آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں اور کائنات کے حکمران جسے پاکستان کے آئین کے مطابق مملکت خداداد پاکستان کا مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا گیا ہے کی ہدایات کے مطابق اس ملک کی تمام پالیسیاں مرتب کریں تاکہ اس کی تائید ونصرت کے حقدار ٹھہرائے جائیں۔حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب مصر میں اسلامی افواج کی فتوحات کی رفتار ذرا کم ہوگئی تو آپ نے مجاہدین کے کمانڈر حضرت عمرو ابن عاصؓ کو نہایت ہی پُرمغز اور حقائق افروز خط لکھا کہ: ''اپنی افواج کا جائزہ لو کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نافرمانی تو نہیں ہو رہی۔ہمیں اللہ تعالیٰ اس لئے فتوحات عطا کرتا ہے کہ ہمارا دشمن اس کا نافرمان ہے۔اگر ہم بھی نافرمان ہو گئے تو اللہ ہمیں اپنی نصرت سے محروم کر دیگا۔پھر جنگ کے نتائج کا انحصار فوجوں کی نفری اور اسلحہ کی برتری پر ہوگا اور ہمارا دشمن دونوں لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتا ہے''۔اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور دوسری اقوام پر غلبہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم من حیث القوم پوری طرح اللہ کے دین میں داخل ہو کر اس کے تابع فرمان بندے اور سچے مسلم بن جائیں۔اگر ہمیں اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کی جستجو ہے تو ہمیں زندگی کے ہر شعبہ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے آئین کی بالادستی کو قبول کرنا ہوگا۔جزوی اطاعت کرنے والوں کو قرآن کریم میں خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

''کیا تم کتاب کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو۔تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔اور جو کام تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان سے غافل نہیں''۔ (85:2)

نارِ جہنم سے نجات کا عشرہ

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

رحمت عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ رمضان کا پہلا عشرہ رحمت، درمیانی بخشش اور آخری نارِ جہنم سے رہائی ہے۔ گویا رحمت کے پہلے دس دنوں میں جو مسلمان نماز، روزہ اور قرآن پڑھنے (سننے) کی پابندی کرتے رہے، تو دوسرے عشرے میں اللہ تعالیٰ ان کے بے شمار گناہوں کو ان کے نامہ اعمال سے مٹا دینے کا حکم دیتا ہے۔ پھر آخری دنوں میں اعتکاف، توبہ اور عفو طلبی کے باعث اس کے جنتی ہونے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ۔ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور بندوں کی نیکیوں کے باعث معاف فرما دیتا ہے۔ لیکن کبیرہ یعنی بڑے گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے خوب رویا جائے اور سچے دل سے توبہ کی جائے۔ اللہ پاک کا وعدہ ہے جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو اللہ کو بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا پائے گا۔

کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ دیر کرنے والے ہلاک ہو گئے، جو کہتے ہیں کہ ہم کچھ عرصہ بعد توبہ کر لیں گے۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”میرے پیارے بیٹے! توبہ کل پر نہ ٹالنا، ایسا نہ ہو کہ اچانک موت آ کر دبا لے اور توبہ کا وقت ہی نصیب نہ ہو“۔ سچے دل سے توبہ کرنے والے کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا فرمان ہے کہ توبہ کرنے والا شخص ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔

رمضان المبارک کے تیسرے عشرے آغاز رحمت عالم ﷺ کی پسندیدہ سنت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم عبادت اعتکاف سے ہوتا ہے۔ اعتکاف کے معنی ہیں ”ٹھہرنا“۔ مسجد میں عبادت کی نیت سے ٹھہرنے کو اعتکاف کہا جاتا ہے۔ اس میں مسلمان دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو کر اللہ کے گھر میں صرف اللہ کی یاد میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اعتکاف کی تین قسمیں ہیں۔ 1۔ اعتکاف فرض، یہ وہ اعتکاف ہے، جو کوئی شخص کسی کام کے پورا ہو جانے کیلئے مانے، یعنی نذر کا اعتکاف۔ اس کی مدت کم از کم ایک دن اور ایک رات ہے۔ اس میں روزہ رکھنا بھی شرط ہے۔ نذر پوری ہو جانے پر اس

اعتکاف کا ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔2۔نفلی اعتکاف جس کو حکمی اعتکاف بھی کہتے ہیں۔اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمان جب مسجد میں داخل ہوتو اعتکاف کی نیت کرے۔اس کی کوئی مدت اور وقت مقرر نہیں اور نہ ہی اس کیلئے روزہ شرط ہے۔اعتکاف کی نیت سے مسلمان جتنی دیر مسجد میں رہے گا، اسے ثواب ملتا رہے گا۔3۔اعتکاف کی تیسری قسم اعتکاف سنت ہے۔یہ رمضان کے آخری نو یا دس دنوں میں کیا جاتا ہے۔اس کیلئے روزہ شرط ہے۔یہ سنت کفایہ ہے یعنی اگر کسی بستی میں ایک مسلمان نے بھی اس سنت کو ادا کرلیا تو یہ سب کی طرف سے ادا ہو جائے گی اور سب کو ثواب ملے گا اور اگر پوری بستی میں کسی شخص نے بھی اعتکاف نہ کیا تو سب گنہگار ہوں گے۔

رسول اکرم ﷺ ہر سال اعتکاف کی پابندی فرمایا کرتے تھے۔حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہر سال دس (یا نو) دن اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔جس سال آپ کو دنیا سے تشریف لے جانا تھا، آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔(بخاری) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف نبی اکرم ﷺ کی پسندیدہ عبادت ہے۔اعتکاف کا وقت بیس رمضان قبل مغرب سے شروع ہوتا ہے اور نو یا دس دن بعد عید کے چاند کی اطلاع ملنے تک رہتا ہے۔

اعتکاف کے مسائل

اعتکاف ،مرد اور عورت ، دونوں کر سکتے ہیں۔مرد کیلئے مسجد میں اعتکاف کرنا ضروری ہے اور عورت گھر کے اندر نماز کیلئے ایک جگہ مخصوص کر کے اعتکاف کرے گی۔

معتکف صرف وضو، غسل اور انسانی ضروریات کیلئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ اس کیلئے مسجد سے نکلنا حرام ہے۔اگر نکلے گا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔حدود مسجد میں وضو کی جگہ بھی مسجد سے باہر ہے، یہاں بھی معتکف صرف وضو ہی کیلئے آ سکتا ہے، ورنہ اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔نماز جنازہ میں شریک ہونے کیلئے بھی نکلنا جائز نہیں، اگر چہ نماز جنازہ، حدود مسجد میں اس جگہ پر ہو، جو مسجد میں شامل نہیں، جیسے مسجد سے ملحق کوئی ہال وغیرہ۔مسجد کے ایک کونے میں پردہ وغیرہ لگا کر معتکف کیلئے جگہ مخصوص کر دینا چاہئے اگر مسجد میں لوگ موجود ہوں تو معتکف کو اپنی مخصوص جگہ میں رہنا چاہئے۔مسجد کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں سے ملاقات، ان کا حال معلوم کرنا اور ضروری بات کر لینا جائز ہے۔

اگر مسجد میں غسل کا انتظام ہو تو وہیں غسل کرے اور اگر انتظام نہ ہو، تو صرف جمعہ کے غسل

کیلئے گھر جا سکتا ہے۔روزانہ صفائی کے غسل کیلئے گھر جانے کی اجازت نہیں۔معتکف جب گھر جائے تو راستے میں کسی سے بات چیت نہ کرے۔صرف سلام کرسکتا ہے اور سلام کا جواب دے سکتا ہے۔یاد رہے کہ معتکف کو گھر جانے کی اجازت صرف اس صورت میں ہے کہ جب مسجد میں انسانی ضروریات پوری کرنے کا انتظام نہ ہو۔

معتکف سے عام مسلمانوں کا ملاقات کرنا، اس کے پاس بیٹھنا بھی باعث ثواب ہے لیکن زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہئے اور نہ ہی دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنی چاہئیں۔اسلام میں اس عبادت کا مقصد درحقیقت ہر سال آبادی میں ایسے متقی اور پرہیز گار انسانوں کا فراہم کرنا ہے، جو پورے سال اپنی بستی میں لوگوں کو دین کی دعوت دیتے رہیں۔معتکف دس یوم خلوت میں عبادت کرتا ہے، اللہ کو یاد کرتا ہے، تو اس عمل سے اس کی روحانی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔عقل تیز ہوجاتی ہے اور تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔یوں اعتکاف سے نکلنے والا شخص پوری طرح اس لائق ہوتا ہے کہ لوگوں میں رشد و ہدایت کا کام کرے۔اس لئے معتکف کو چاہئے کہ وہ ان دنوں کو زیادہ سے زیادہ نوافل پڑھنے میں، قرآن حکیم کی تلاوت کرنے میں، درود شریف پڑھنے میں اور دینی معلومات بڑھانے میں صرف کرے۔

نزول قرآن کا مہینہ

رمضان اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کے نزول کا مہینہ ہے، قرآن حکیم میں ہے کہ رمضان کا مہینہ، جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کو حق کا راستہ دکھاتا ہے اور اس میں ہدایت کی روشن دلیلیں ہیں اور یہ حق و باطل کو علیحدہ علیحدہ کرنے والا ہے''۔ (سورہ بقرہ:182)

اللہ تعالیٰ کی یہ آخری کتاب (قرآن حکیم) اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔یہ قیامت تک مسلمانوں کیلئے ضابطہ حیات اور دستور العمل ہے۔قرآن کریم کے نزول کی ابتدا غار حرا میں ہوئی۔اس وقت رسول اکرم ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال چھ ماہ کی تھی۔نزول قرآن کا سلسلہ تیئیس برس تک جاری رہا۔اللہ کی طرف سے اس کے لانے والے روح الامین (حضرت جبرائیل علیہ السلام) تھے۔جیسا کہ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا۔

''اور بے شک یہ کتاب رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے، اسے لے کر روح الامین اترے ہیں (اے محمد ﷺ) آپ کے قلب پر تاکہ آپ لوگوں کو ڈرانے والے ہو جائیں۔یہ ایسی عربی

زبان میں ہے، جو بالکل واضح ہے اور اس کا ذکر پہلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے''۔
(الشعراء:196-192)

پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی، جو سورہ اقراء کی یہ پانچ آیتیں ہیں، ''آپ پڑھیئے اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے (سب کو) پیدا فرمایا۔ اس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ پڑھیئے آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے۔ اسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا''۔ (العلق:5-1)

قرآن حکیم عرب کی اس وادی غیر ذی زرع میں نازل ہوا، جہاں کے لوگ جانوروں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں معزز ان لوگوں کو سمجھا جاتا تھا جو سب سے بڑے قاتل، ظالم، جواری اور شرابی ہوں۔ یہ ایسا معاشرہ تھا جہاں بتوں کی پرستش کی جاتی تھی اور لڑکیوں کو پیدائش کے بعد زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ حامل قرآن حضرت محمد مصطفی ﷺ کے مخاطب اسی معاشرے کے لوگ تھے لیکن ان لوگوں کو حضور ﷺ نے قرآن سنایا تو یہی غیر مہذب لوگ دنیا کو تہذیب کا درس دینے لگے، ظلم و ستم کرنے والے عدل وانصاف کے پیغامبر بن گئے۔ بتوں کو پوجنے والے توحید کے متوالے بن گئے۔ ہر وقت ذرا سی بات پر لڑنے والے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ عورتوں کو ذلیل وخوار اور رسوا کرنے والے، ان کی عزت وعصمت کے رکھوالے بن گئے۔ غرضیکہ رحمت عالم ﷺ نے اللہ کا کلام سنایا تو مکہ ہی میں نہیں عرب میں نہیں، بنی نوع انسان میں ایک انقلاب آیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

شب قدر:۔

قرآن حکیم کی سورہ القدر میں ہے:۔

''بے شک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں اُتارا ہے اور آپ کچھ جانتے ہیں، شب قدر کیا ہے؟ شب قدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے، اُترتے ہیں فرشتے اور روح القدس، اس میں اپنے رب کے حکم سے، ہر اچھے کام کیلئے۔ یہ سلامتی وامن ہے طلوع فجر تک''۔ (القدر پ:30)

اس رات کا نام اللہ تعالیٰ نے خود لیلۃ القدر رکھا، یعنی عظمت والی رات کیونکہ اس رات میں عظمت والے رب کا کلام اس کے عظمت والے رسول (ﷺ) پر نازل ہوا یوں اس عظمت والی

کتاب پر عمل کرنے والے بھی عظمت والے ہوگئے ۔تمام اُمتوں سے افضل امت بن گئے ۔

قدروالی یہ رات کونسی ہے؟ خود قرآن نے ہمیں بتایا کہ قرآن رمضان المبارک میں نازل ہوا اور یہ بھی بتایا کہ اس رات کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں کی عبادت سے زیادہ ہے ۔اس ایک رات میں اللہ تعالیٰ کی جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، وہ ہزار مہینوں سے بھی زیادہ ہیں ۔اپنی اس ایک رات کی عبادت سے ہمارے بندے جو مرتبہ پاسکتے ہیں، وہ ہزار مہینے کی عبادت ومحنت سے بھی نصیب نہیں ہوسکتا۔

قدروالی اس رات کا پتہ ہمیں اللہ کے آخری رسول ﷺ کے اس فرمان سے ملتا ہے فرمایا: شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو"۔یعنی اکیسویں، تئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں، ان پانچ راتوں میں سے ایک رات شب قدر یقین کر کے ان میں خوب عبادت کریں اور دعائیں کریں ۔

بعض علمائے اُمت نے قیاس اور قرینے سے ثابت کیا ہے کہ رمضان کی ستائیسویں شب، شب قدر ہے ۔حضرت ابی ابن کعبؓ کو تو اس پر اس قدر یقین تھا کہ وہ قسم کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ رمضان کی ستائیسویں شب قدر ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جمہور امت رمضان کی ستائیسویں شب ہی کو شب قدر سمجھتے ہیں ۔اور اس رات جاگ کر عبادت کرتے ہیں ۔نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرائیل فرشتوں کی جماعت کے ساتھ اُترتے ہیں ۔ہر اس کھڑے، بیٹھے کو دعائیں دیتے ہیں جو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے"۔

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں انشاءاللہ ہمیں یہ عظمت والی رات نصیب ہوگی۔ ہمیں اسے کیلئے پوری طرح تیاری کرنی چاہئے ۔ظاہری تیاری تو یہ ہے کہ اس رات ہم خوب اچھی طرح غسل کریں، صاف ستھرے کپڑے پہنیں، خوشبو استعمال کریں کہ یہ فرشتوں سے ملاقات کی رات ہے لیکن باطنی تیاری یہ ہے کہ ہم اپنے دلوں کو صاف کرلیں ۔اگر ہمارے والدین ہم سے ناراض ہیں تو ان سے معافی مانگ لیں ۔اگر ہم نے کسی کا حق چھینا ہو، تو وہ ادا کردیں۔سود کھایا ہے تو اس سے توبہ کرلیں ۔اپنے دل سے ہر قسم کی کدورت، نفرت، بغض، حسد اور کینہ نکال دیں اور مسلمانوں کی محبت والفت کا جذبہ دل میں پیدا کریں ۔انشاءاللہ ہمارے اس عمل سے رب تعالیٰ بھی خوش ہوگا اور فرشتے بھی ہم سے ملاقات کر کے خوش ہوں گے ۔ (بشکریہ نوائے وقت)

ذکر کی اہمیت اور اس کے مدارج

(احمد رضا خاں توحیدی)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے اٹھائیسویں سپارے میں اہل ایمان سے مخاطب ہیں۔

ولاتکونوکالذین نسوا للّٰہ فانسھم انفسھم اولئك ھم الفسقون

ترجمہ: ''ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا۔(پھر سزا کے طور پر) اللہ نے انکا اپنا آپ بھلا دیا، یہی لوگ فاسق ہیں''۔ (الحشر۔19)

اللہ پاک کیونکہ ہمارے سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں ۔اس لئے ہمیں ایسا کلیہ بتایا جا رہا ہے جو ہمارے فائدے میں ہے اور وہ ہے ''اللہ کی یاد'' اس سے پچھلی آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ''دیکھو کہ کل کیلئے کیا عمل آگے بھیج رہے ہو'' اور اس آیت سے یہ پتہ چل گیا کہ ''اللہ کی یاد'' ہی وہ عمل ہے جو کل (قیامت) ہمارے کام آئے گا۔ اور اللہ کو بھولنے کی سزا دنیا میں کیا ملے گی کہ انسان خدا فراموشی کے نتیجے میں خود فراموشی تک پہنچ جائے گا۔ اُس کی زندگی گھر کے اخراجات پورے کرتے اور ایسی ہی ''بیگار'' میں گذر جائے گی کہ اُسے اپنے مقصد تخلیق کا پتہ ہی نہ چل پائے گا اور اس کا نتیجہ لازمی طور پر تباہی ہوگا۔ اور اسے خطاب ملا ''فاسق'' کا یعنی گنہگاروں کا اسفل ترین درجہ انسان کو اس بھول کا نتیجہ اس لئے بتایا جا رہا ہے کہ شاید سزا سن کر ہی اپنی روش سے باز آ جائے۔

اب جبکہ اس بات کا پتہ چل گیا کہ ''اللہ کی یاد'' ہی کامیابی کی کنجی اور زادِ راہ ہے تو

1 اسکی مکمل تعریف کیا ہے؟

2 اللہ کی یاد قائم کیسے ہوگی؟

3 اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ یاد قائم ہوگئی ہے۔

1۔ بیشتر علماء اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھنا ہی اصل میں اللہ کی یاد ہے۔ یہ بات کسی حد تک تو درست ہے مگر یہ تعریف اس یاد کے حقیقی معنی ادا نہیں کر پا رہی۔ بلکہ اس کی مکمل تعریف سورت مزمل کی یہ آیت ہو سکتی ہے۔

واذكر اسم ربك وتبتل اليه تبتيلا۔

ترجمہ: ''اپنے رب کے نام کا ذکر کرا ور تمام خلائق سے کٹ کر اُسی کا ہو رہ۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اگر آپ کے اردگرد کا ماحول صالح افراد پر مشتمل ہے تو انکی دیکھا دیکھی یا تنقید کے ڈر سے آپ اوامر ونواہی کا خیال تو رکھیں گے جبکہ اللہ کی محبت جو کہ اعمال کی روح ہے وہ غائب ہوگی۔ بقول علامہ اقبالؒ

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملیگا نماز میں

ایک اور جگہ بھی اسی روح کا ذکر کرتے ہیں

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

اوپر دی گئی آیت سے ایک بات واضح ہوگئی کہ اللہ کو ہر وقت یاد رکھنا حرف اسکے نام کے ذکر سے ہی ممکن ہے۔ جو کہ صرف خاص وقت کیلئے نہ ہو بلکہ 24 گھنٹے کیلئے ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''کہ اللہ کا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے۔''

2۔ دوسری بات یہ کہ یاد قائم ہوگی۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے۔ صرف مطالعہ کرنے سے یا بڑے بڑے علماء کے وعظ سننے سے یہ یاد پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایسی خالص ''صحبت'' سے پیدا ہوگی۔ جنکے اندر یہ یاد بدرجہ اولیٰ موجود ہو۔ اور وہ صرف اور صرف ''اللہ والے بزرگ'' ہیں جو ہر وقت اللہ کے ذکر میں رہتے ہیں اور جنکے دیدار ہی سے دل بیدار ہو جاتے ہیں۔

3۔ اس یاد کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ صحبت صالحین کے اثر سے متعلقہ فرد کیلئے اللہ کے احکام بجا لانے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے (لوگوں کا دباؤ یا رویہ یا ترغیب اس پر اثر انداز نہیں ہوتی) یعنی ''روح بیدار ہو جاتی ہے ایک اور بات مشاہدے میں آتی ہے جب کسی نے اللہ والے کی صحبت اختیار کی تو اسکے اندر مومنین کی وہ تمام صفات پیدا ہو گئیں جو کہ قرآن وحدیث میں موجود ہیں جبکہ متعلقہ فرد نے ان صفات (Qualities) کے متعلق کبھی پڑھا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی سن رکھا تھا، ''ایسا آدمی حضورؐ کے اس فرمان کے مصداق بن جاتا ہے کہ برائی اسکے دل میں کھٹکتی اور اچھائی

سکون دیتی ہے" ایسی قوت مدافعت پیدا ہوجاتی ہے جو اسے خودبخو دگناہوں سے بچاتی ہے۔

"حضورؐ کا ارشادگرامی ہے۔مومن کیلئے دوبارہ گناہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا آگ میں ڈالا جانا"۔

ان باتوں سے مزید آگے بڑھ جائیں تو متعلقہ فرد کو "اللہ سے شدید محبت" ہوجائیگی۔

والذین امنو اشد حباًللّٰه (البقرہ) "ایمان والے شدید محبت اللہ سے کرتے ہیں"

ایسے آدمی کو اس بات کا ڈر تو ہوگا ہی کہ وفاسقوں میں سے نہ ہوجائے مگر سب سے زیادہ خوف اللہ کی محبت چھٹنے کا ہوگا۔کہ میرا مالک مجھ سے نظر التفاف نہ ہٹالے۔"اب اسے پستی میں گرنے کے خوف کی بجائے بلندی کی طرف جانے کا اشتیاق زیادہ ہوگا"۔

گویا یہ بات واضح ہوگئی کہ "اللہ والے بزرگوں" کی صحبت ہی سے اللہ کی یاد کی عملی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ والے اس یاد کو قائم کرنیکے لئے دوسری چیزوں کے علاوہ اللہ کا ذکر بھی بتاتے ہیں۔جو انتہائی معتبر اور زود اثر ہے۔ذکر کی اہمیت وفضیلت سے اللہ سے محبت کی خواہش رکھنے والا ہر فرد آگاہ ہے۔یہاں صرف حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک روایت کافی معلوم ہوتی ہے۔

"اہل بہشت کو کسی اور بات کی حسرت نہ ہوگی سوائے اُن گھڑیوں کے جو انہوں نے دنیا میں اللہ کی یاد کے بغیر گذار دیں تھیں"۔

کچھ دیر تیری یاد سے غافل رہا تھا میں
وہ لمحے کر رہے ہیں مجھے شرمسار سے

امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "کیمیائے سعادت" میں ذکر کے چار مدارج بیان کیے ہیں۔سلسلہ توحیدیہ کے بھائی چونکہ اللہ کی محبت اور معرفت کے خواہش مند ہیں اس لئے میرے خیال میں ہمیں چوتھے درجے سے کم پر راضی نہیں رہنا چاہیے۔اور انتہائی کوشش اور دعا کرنی چاہیے کہ ذکر اور یاد کا یہ بلند مقام حاصل ہوجائے۔فرماتے ہیں۔

اول:۔ ذکر زبان پر ہو اور دل اس سے غافل ہو۔یہ بالکل اثر سے خالی نہیں لیکن بہت

ضعیف ہوتا ہے کیونکہ ذکر الٰہی میں مشغول زبان ،لغویات اور خاموش رہنے سے بہتر ہے۔

دوم:۔ یہ ایسا ذکر ہے جو دل میں موجود تو ہوتا ہے ۔مگر پوری طرح قرار نہیں پکڑتا اور اسے تکلف اور کوشش سے دل میں رکھنا پڑتا ہے اور اگر اس کوشش میں ذرا سی ڈھیل ہو جائے تو دل اپنی طبعی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے اور نفس کی باتوں میں آ کر غافل ہو جاتا ہے۔

سوم:۔ ذکر الٰہی دل میں گھر کر چکا ہو اور اس پر متمکن اور مسلط ہو چکا ہو۔یہاں تک کہ کسی دوسرے کام کو کرنیکے لئے جدوجہد درکار ہو، یہ بڑی بات ہے۔

چہارم:۔ جسکا ذکر مطلوب ہے وہی دل میں بس چکا ہو، ذکر کا تصور ہی دل سے محو ہو جائے اور صرف مذکور (اللہ) ہی دل میں باقی رہ جائے، کیونکہ ذکر یا عربی میں ہو گا یا فارسی میں اور جو ذکر (الفاظ) کو دل میں رکھتا ہے اور جو مذکور (اللہ) کو دل میں رکھتا ہے ان میں بہت فرق ہے۔یہ انتہائی درجہ کی محبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔جسے عشق کہتے ہیں۔

اس درجے کو فنا و نیستی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔اور انسان پر ایسے عظیم الشان واردات و حالات منکشف ہونے لگتے ہیں جن کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں ،فرشتے ،ارواح اور انبیاء کی شکلیں اس پر ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

اس درجہ میں آدمی دنیاداروں کو حیرت و تعجب سے دیکھتا ہے کہ آخر یہ لوگ کیوں دنیا میں اس درجہ کھوئے ہوئے ہیں۔ان پر ترس آنے لگتا ہے کہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔

آگے چل کر امام صاحب فرماتے ہیں اگر اللہ کا ذکر کثرت سے کرنے کے باوجود کسی پر یہ حالات منکشف نہ ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ذکر حق کو چھوڑ دے، کیونکہ سعادت کا انحصار فقط احوال کے مکاشفے پر نہیں ،اور جو کچھ اس دنیا میں نہیں دیکھ سکا مرنے کے بعد دیکھ لے گا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی ''یاد'' کے اعلیٰ ترین مدارج عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں دستگیری فرمائے۔آمین

فنا و بقاء

(ابن طاہر)

صوفیاء کے نزدیک ''فنا'' سے مراد مذموم اوصاف کا ختم ہونا ہے اور بقا سے مراد محمود اوصاف کا بندہ کے ساتھ قائم ہونا ہے انسان میں ان دونوں قسموں میں سے ایک نہ ایک صفت ضرور باقی رہتی ہے۔ایک کی نفی ہو جانے سے لامحالہ دوسری کا اثبات ہو جاتا ہے اور جو اپنے اوصاف مذمومہ سے فنا ہو چکا ہو اس پر صفاتِ محمودہ ظاہر ہونے لگ جاتے ہیں اور جس پر مذموم خصلتیں غالب آتی ہیں تو اس سے صفات محمودہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھیں انسان کے اندر تین اوصاف پائے جاتے ہیں۔

یا تو وہ افعال ہیں یا اخلاق ہیں یا احوال ہیں۔

افعال وہ ہیں جن میں انسان اپنے اختیار سے تصرف کرتا ہے اخلاق وہ صفات ہیں جو انسان میں فطری طور پر پائے جاتے ہیں۔البتہ کوشش کرنے سے غیر اخلاقی صفات کو بدلا بھی جا سکتا ہے۔اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے صوفیاء تزکیہ اخلاق پر زور دیتے ہیں۔جیسے کہ بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے بھی تزکیہ اخلاق کیلئے دو چیزیں اہم قرار دیں۔پہلی غصہ اور نفرت کو نفی کرنا اور دوسری عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنا۔احوال وہ ہیں جو شروع میں انسان پر وارد ہوتے ہیں مگر ان کی صفائی کا دارومدار اعمال کی صفائی پر ہے۔اس اعتبار سے احوال بھی اخلاق کی طرح شمار ہوں گے۔کیونکہ جب انسان دل سے اخلاق کے ساتھ جنگ کرتا رہے اور اپنی کوشش سے اپنے خراب اخلاق کو دور کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ بھی مہربانی فرما کر اس کے اخلاق کو اچھا کر دیتے ہیں اعلیٰ اخلاق کا سلوک طے کرنے میں مرکزی مقام ہے۔قبلہ انصاریؒ صاحب اپنے ایک خطبے میں اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جن لوگوں میں حرارت و جذبہ بھی کافی پیدا ہو جائے، کشف و کرامات کی طاقت بھی آ جائے۔غصہ میں بھی کمی ہو جائے غرور و نفرت اور دوسرے کبیرہ نقائص بھی جاتے رہیں وہ انشاءاللہ ضرور فائز المرام ہوں گے اور ان کو خدا کا قرب و لقاضرور میسر آئے گا۔ان بزرگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ناسوت و ملکوت طے کر

کے جبروت تک پہنچ گئے ہیں جو ایک نہایت اعلیٰ مقام اور بڑا مرتبہ ہے۔لیکن یہاں پر بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جبروتی بزرگوں میں بھی کچھ غصہ ضرور رہ جاتا ہے جسے لوگ جلال کہتے ہیں۔جبروت سے آگے لاہوت ہے اور اس کو طے کرنے کیلئے ضروری ہے کہ طبیعت اور اخلاق میں بے انتہا نرمی شگفتگی اور لطافت پیدا کی جائے اور چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی کمی کو بھی دور کر دیا جائے۔صاحب جلال ہونا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ہم کو ہر بات میں نبی کریم ﷺ کی عادات و خصائل اور اسوہ حسنہ کو سامنے رکھنا چاہیے۔یاد رہے کہ حضور اکرم ﷺ سراپا جمال تھے اور اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو رحمۃ اللعالمین کا خطاب عطا فرمایا ہے۔جس نے کوشش کر کے اپنے اخلاق کو ٹھیک کر لیا اور اپنے دل سے حسد، کینہ، بخل، غصہ، تکبر اور اسی قسم کی دیگر رعونتوں کو دور کر لیا تو اس کے متعلق یوں کہا جائے گا کہ فلاں اپنے اخلاق بد سے فنا ہو گیا۔اور جب وہ اخلاق بد سے فنا ہو گیا تو وہ صدق کے ساتھ باقی رہے گا۔

اب چونکہ احوال کی بات ہو رہی ہے تو فناء کے اندر کونسے احوال طاری ہوتے ہیں ان کے بارے میں جاننے کیلئے میرے خیال میں تعمیر ملت سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔قبلہ انصاری صاحب فنا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عرصہ دراز تک نفی ما سویٰ اللہ کی مشق کرتے کرتے دن رات میں وقتاً فوقتاً ایک ایسی بے خودی طاری ہوتی ہے جس میں سالک کو اپنے ماحول کا بہت ہی دھندلا سا احساس رہ جاتا ہے۔اور ذہن میں اللہ ہی کا خیال باقی رہتا ہے۔یہ بے خودی رفتہ رفتہ اس قدر بڑھتی ہے کہ ماحول بلکہ خود اپنے جسم کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔مگر وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ جو کچھ مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ اللہ ہی اللہ ہے یعنی اُسے اگر چہ اپنے جسم کا احساس نہیں ہوتا لیکن اپنی ہستی یا ذات کا احساس ضرور ہوتا ہے۔یہاں پہنچ کر کئی کیفیات اور بھی طاری ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ ماحول اور اس کی اشیاء کی طرف خیال رجوع ہو جاتا ہے۔اور اپنی ہستی کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔ایسی حالت میں وہ بعض اوقات تو یہ دیکھتا ہے کہ تمام اشیاء تسبیح اور سجدے میں مصروف ہیں

اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہی ہیں۔ دوسری کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ ماحول اور اشیاء کا خیال نفی ہو کر صرف اللہ کا خیال باقی رہتا ہے لیکن اپنی ہستی کا کچھ نہ کچھ خیال بھی موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے آپ کو کل کا ایک جز و محسوس کرتا ہے۔ تیسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی ہستی اور اپنی ہستی دونوں کے احساسات گم ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں۔ چوتھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی ہستی کا احساس مکملا غائب ہو جاتا ہے اور اللہ کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ یعنی نہ احساس کرنے والا رہتا ہے نہ محسوسات یہ کیفیت مکمل فنا کی کیفیت ہے۔ پہلی کیفیات ناقص ہیں۔ فنا کی یہ کیفیت پختہ ہونے کے بعد اگر سالک کوشش میں لگا رہے اور یہیں قیام نہ کرے تو وہ اپنی ذات کا پھر احساس کرنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو الگ اور تمام اشیاء کی اور اپنی ہستی کو الگ محسوس کرتا ہے۔ یا دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اللہ اللہ ہی ہے اور مخلوق مخلوق۔

اللہ خالق باقی اور قادر ہے اور مخلوق فانی اور مجبور۔ یہ بقا کی کیفیت ہے۔

یہ تو تھیں فنا و بقا کی کیفیات اور اب یہ بات کہ ان چیزوں کا مشاہدہ کہاں پر ہوتا ہے تو میرے خیال میں اس کیلئے حضرت بہاؤالدین بخاری نقشبندیؒ کا مندرجہ ذیل قول عین صحیح ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ

اہل اللہ فنا و بقا کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اپنے آپ میں دیکھتے ہیں اور جو کچھ پہچانتے ہیں اپنے آپ میں ہی پہچانتے ہیں اور ان کی حیرت اپنے وجود میں ہے۔ اور اسی مقام پر عارفین کو اللہ تعالیٰ عزوجل کی معرفت ہونا شروع ہوتی ہے باقی اصل علم تو اللہ رب العزت کے ہی پاس ہے۔

میری اللہ سے دُعا ہے کہ تمام توحیدی بھائی اللہ کے قرب کے مزے لوٹیں اور اپنی روحانی طاقت سے معاشرتی انقلاب برپا کر دیں۔

اللہ میری اور آپ سب بھائیوں کی سعی کو قبول و منظور فرمائے آمین!

فتح و غلبہ کے دو الٰهی نظام

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

نوٹ:-یہ تقریر 16 شعبان 1388ھ (8 نومبر 1968ء) کو "مدرسہ ثانویہ طیبہ" مدینہ منورہ کے وسیع ہال میں کی گئی۔اس جلسہ میں جامعہ اسلامیہ، مدارس اور کالجوں کے اساتذہ اور طلباء، علما اور سربرآوردہ حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔اس تقریر کو عرب اسرائیل جنگ کے تناظر میں دیکھا جائے۔

دو الٰہی نظام

اس کائنات میں دو نظام کارفرما ہیں، پہلا طبعی نظام جسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کیلئے منتخب کیا ہے، اور اسے پوری کائنات کیلئے دستور بنایا ہے، اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کثرت قلت پر، امارت افلاس پر، اسباب ووسائل کی فراوانی قلت اسباب پر اور قوت ضعف پر غالب رہتی ہے، تنظیم، اتحاد، عزم، قوتِ ارادی، مستقل مزاجی، مستعدی یہ وہ صفات اور خصوصیات ہیں جو ہمیشہ اپنے اضداد پر غالب رہتے ہیں، ہم سب اپنی روزمرہ زندگی میں اس نظام کے تجربات سے گذرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں کچھ خاصیتیں رکھی ہیں جو ماہ وسال کی گردش، زمانے کے اُلٹ پھیر اور صدیوں کی مدتِ دراز پر بھی ان سے جدا نہیں ہوتیں، آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی گئی ،لہٰذا آگ ہمیشہ جلاتی ہے، پانی میں اپنی خاصیت ہے، مٹی کے کچھ خواص ہیں، غرض تمام اشیاء میں مخصوص خواص ہیں، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

منصفانہ قانون، میزانِ عدل

طبعی نظام کا قانون ایک ایسا منصفانہ قانون ہے کہ جو کسی کی رعایت نہیں کرتا، یہ طبعی قانون ایک انسان پر دوسرے انسان یا ایک گروہ پر دوسرے گروہ کو افضل ٹھہراتا، حتیٰ کہ یہ قانون مومن و کافر، متقی اور فاجر، نیک و بد، مصلح اور مفسد تک میں امتیاز نہیں برتتا۔آگ ہر اس شخص کو جلاتی ہے، جو اس کی طرف بڑھتا ہے، وہ نہ کسی مصلحت کی رعایت کرتی ہے، اور نہ انجام سے خائف ہوتی ہے، یہ وہ میزانِ عدل ہے جو اشیاء کا صحیح صحیح ناپ تول کرتی ہے، نہ مداہنت برتتی ہے نہ

رعایت، اورفرق وامتیاز سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے، یہ وہ قانون ہے، جس کا تجربہ انسان نے اپنے وجود سے آج تک ہزاروں سال کی طویل مدت میں کیا ہے، اس کے تجربات ، واقعات اور مشاہدات کے تسلسل سے انسانیت کی تاریخ کے مختلف گوشے پر ہیں، اوران میں آپ کوئی استثناء نہیں پائیں گے۔

ایک حکومت دوسری حکومت پر غالب آتی ہے، طاقتور اپنے حریف کو زیر کرتا ہے، ایک توانائی دوسری توانائی کو ختم کرتی ہے، ایک تعداد اپنے مقابل تعداد کو مغلوب کرتی ہے، اور یہ سب اس قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے، جس کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

دلائل سے بے نیاز

قانونِ طبعی اپنے اثبات کیلئے نہ بحث و دلائل کا محتاج ہے نہ فکر و فلسفہ کا حاجت مند۔ یہ ایک بدیہی حقیقت، تسلیم شدہ قانون، فطری امر، آزمودہ علم اور ہر ایک کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے، چنانچہ آسمانی کتابوں اور انبیائے کرام کا یہ کبھی موضوع بحث نہیں رہا، یہ قانون فطرت پوری قوت سے نافذ اور ہر طرح آزاد ہے، اگر اسے اس کے فطری حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے مطلق فرماں روائی حاصل ہو تو اس کے عمل اور کارفرمائی میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی۔

دوسرا نظام

یہ وہ نظام ہے جو انبیاء کرام کا موضوع رہا ہے، آسمانی صحیفوں نے اسے اپنا موضوع بنایا ہے، اس کی تشریح اور توضیح کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چند مقاصد کو افضل اور ممتاز اور (خواص اشیاء کے حقیر مقاصد و نتائج سے زیادہ) احترام اور اہتمام کا مستحق قرار دیا ہے۔

حقیر اس مفہوم میں کہ آگ جلاتی ہے، پانی ڈبوتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے، تریاق زہر کے اثر کو زائل کرتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، مرض لاغر اور کمزور کرتا ہے، دوا صحت اور آرام بخشتی ہے، یہ تمام نتائج اور مقاصد قابل قدر اور عقل کیلئے قابل تسلیم ہیں، مگر ان کے علاوہ چند اور اعلیٰ مقاصد ہیں، جو ان سے زیادہ توجہ و اہتمام کے مستحق ہیں۔ اور وہ ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت، انسان کی ہدایت، مقصد تخلیق، انسانیت کی سعادت، عدل و انصاف، انصاف پرور حقوق آشنا اور صالح

زندگی اور ایک ایسے مثالی معاشرے کا قیام جس میں خوف خدا ہو، انسانیت کا احترام ہو، حقوق کی ادائیگی اور امانت کی حفاظت ہو، جس میں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کی سہل تر راہ میسر ہو اور ان کے قوٰی اور صلاحیتوں کا نشوونما ایسے ماحول میں ہو سکے کہ ان کی رسائی اس مطلوب کمال اور اعلیٰ مقصد تک بآسانی ہو جائے، جس کے خاطر اس کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔

طبعی نظام کی شکست

یہی وہ نظام ہے، جس کے خاطر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا، آسمانی کتابیں نازل فرمائیں، اسی نظام کے آگے طبعی قوانین سرنگوں ہوئے اور انہیں اپنی خاصیتوں کو بدل دینا پڑا۔

جب دو مقاصد کا تصادم ہوتا ہے، فطری نظام اور اس شرعی نظام کا جو عقل، دین اور اخلاق کا تابع ہوتا ہے، اور یہی کائنات کا مقصد وجود اور انسان کا مقصد تخلیق بھی ہے تو پلڑا شرعی نظام کا بھاری ہو جاتا ہے، جب سیدنا حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ کی سنت آگ میں جاری تھی، طبعی عوامل کارفرما تھے، آگ ہزاروں سال سے جلا رہی تھی، انسانی تاریخ نے اپنی دیانت، دقتِ نظر، تحقیق و جستجو کے باوجود ایک واقعہ بھی ایسا محفوظ نہیں کیا کہ آگ نے اپنے فطری عمل سے کسی بادشاہ یا عالم کے احترام میں پس و پیش کیا ہو، کیونکہ اس کا کام تو جلانا ہی ہے، لیکن طبعی نظام کا تصادم یعنی آگ کا ٹکراؤ، اُس شرعی نظام سے ہوا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات کی تخلیق کی ہے، جس میں آگ، پانی، اجرام فلکی، ہزاروں زمینی اشیاء اور مختلف غذائیں ہیں، اس سے جب آگ کی فطرت ہدایت کی فطرت سے متصادم ہوئی تو آگ کو حکم دیا گیا کہ وہ نہ جلائے، آگ سے وہ جلانے کی صلاحیت سلب کر لی گئی جو ابتدائے آفرینش سے اس میں موجود تھی، آگ نے شاید یہ غیبی آواز سنی ہو جسے نہ نمرود سن سکا نہ کوئی اور انسان، کہ خبردار ابراہیمؑ کو نہ جلانا میں وہ ہستی ہوں جس نے تجھے جلانے کی خاصیت عطا کی ہے، لیکن ابراہیمؑ کی جس مقصد کے خاطر تخلیق ہوئی ہے اور انہیں نبوت سے سرفراز کر کے تبلیغ و ہدایت کے لئے مخلوق کے پاس بھیجا گیا ہے، یہ وہ اعلیٰ اور ارفع مقاصد ہیں کہ جن کے آگے تجھے اپنی خاصیتوں کے ساتھ ہزاروں بار سرنگوں ہو جانا چاہئے، ابراہیمؑ کے کپڑوں تک کو نہ چھونا چہ جائیکہ ان کا پاک و مقدس

جسم اور مومنانہ قلب سلیم جو دعوت نبوت کا مسکن اور امین ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔

ولقد اتینا ابرھیم رشدہ من قبل وکنا بہ علمینo(انبیاء۔۵۱)

اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی، اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔

اس امر الٰہی کے آگے آگ نے سپر ڈال دی، دین فطرت کے مقابل آگ کی فطرت اور خاصیت کو سرنگوں ہونا پڑا، کیونکہ دین فطرت ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے بغیر اس کائنات کا وجود عبث اور بے معنی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم آگ کو تسلیم کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے سے اس نے گریز کیا اور ایک جاں فزا خنکی میں تبدیل ہوگئی۔

قلنا ینارکونی برداو سلما علی ابراھیم oوارادوا بہ کیدا فجعلنھم الاخسرینo (انبیاء۶۹،۷۰)

ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام پر وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کردیا۔

انبیاء کی بے سرو سامانی اور بے اسبابی

آپ حضرات یہ بخوبی جانتے ہیں کہ انبیائے کرام کی بعثت جن قوموں میں ہوئی وہ قومیں اپنے ساز و سامان کی کثرت اور مادی ترقی کو کامیابی کا معیار سمجھتی تھیں، نبی پر ایمان لانے والے غرباء ان کیلئے حجاب بن جاتے ،اس معاملے میں ہر نبی اور اس کی قوم میں عظیم تفاوت تھا، یہ بدیہی حقیقت دلیل کی محتاج نہیں، قرآن اس قسم کے واقعات، دلائل اور شواہد سے پر ہے، جب نوحؑ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو ان کی قوم نے کہا:۔

قالوا انومن لک واتبعک الارذلونo(شعراء۔۱۱۱)

انہوں نے جواب دیا" کیا ہم تجھے مان لیں، حالانکہ تیری پیروی رذیل لوگوں نے اختیار کی ہے"۔

اور یہ بھی کہا کہ:۔

ومانرك اتبعك الا الذين هم اراذلنا بادی الرای وما نری لكم علينا من فضل بل نظنكم كذبين ○ (ہود۔۲۷)

''اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں''۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انہیں کہا گیا:۔

قالوا يشعيب ما نفقه كثيرًا مما تقول وانا لنرك فينا ضعيفا ولولا رهطك لرجمنك وما انت علينا بعزيز ○ (ہود۔۹۱)

''انہوں نے جواب دیا اے شعیب تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو''۔

حضرت موسیٰ اور ان کے کمزور رفقاء اور ان کے حریف فرعون اور اس کے لشکر کی کیا نسبت تھی؟

قرآن کہتا ہے:۔

ونادى فرعون فى قومه قال يقوم اليس لى ملك مصر وهذه الانهر تجرى من تحتى افلا تبصرون ○ ام انا خير من هذا الذى هو مهين ○ ولا يكاد يبين ○ فلولا أُلقى عليه اسورة من ذهب اوجآء معه الملئكة مقترنين ○فاستخف قومه فا طاعوه انهم كانوا قوماً فسقين ○(زخرف۔۵۱،۵۴)

''ایک دن فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو

ذلیل وحقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کرسکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اُتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی درحقیقت وہ تھے ہی بڑے فاسق لوگ"۔

اور حضرت ﷺ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ آپؐ اپنی قوم میں کس قدر بے سہارا اور آپ کے چند رفقاء کتنے بیکس اور مظلوم تھے، اللہ تعالیٰ اس دور کو یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

واذکروا اِذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس (انفال۔۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک نہ لے جائیں"۔

حتیٰ کہ ان کی قوم نے ان چند نفوس کو اپنے وطن مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت پر مجبور کیا جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔

غیبی تائیداور اسباب

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام طبعی قوانین کو اس اعلیٰ اور افضل مقصد کے تابع کیا ہے، جس پر انسان کی سعادت کا انحصار اور نجات کا دارومدار ہے، اگر اسباب اور وسائل کو ہر موقع پر اپنی کارکردگی کی پوری آزادی ہوتی ،فطرت اپنی مقررہ اور طے کردہ رفتار سے ہر لمحہ سفر کرتی تو انبیاء کرام کی دعوت کی کامیابی مشکوک تھی، طبعی حالات کا غلام ماحول اور یہ مادی معاشرہ دعوت نبوی کو خدانخواستہ نگل جاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اخلاق وصفات میں بھی چند خاصیتیں رکھی ہیں، اسی طرح قوی، توانا اور موثر جس طرح مادی اشیاء میں رکھی گئیں۔

سچ کی خصوصیت ہے اور اس کا اپنا ایک قانون ہے، امانت، خوفِ خدا غرض ان سب کا اپنا ایک نظام ہے، اعلیٰ صفات، احترام انسانیت، عدل، مساوات، رواداری، مروت، احسان، ایثار، قربانی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، یہ وہ امتیازات، عادات اور اعمال ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے بڑی

توانائی، پراسرار طاقت،قوت تسخیر ،روحانیت ،نصرت اور کامرانی عطا کی ہے، کیونکہ وہ بڑا قادراور علیم ہے۔

کامیابی کا رمز

جب اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا انہیں رسالت سے سرفراز کیا اور اپنی کتابوں کو نازل فرمایا تو ان انبیاء نے عقائد اور ایمان کی دعوت دی، اچھے اخلاق سے مزین اچھی صفات سے آراستہ ہونے کا پیام دیا، اللہ نے انسانوں سے یہ وعدہ کیا کہ عقائد و اعمال اور اخلاق و صفات میں اصلاح کے ذریعہ دنیا میں کامیابی، غلبہ اور فتح کی میں ضمانت دیتا ہوں تمہاری کامیابی اور قوت کا رمز یہی دعوت ہے جو انبیاء لے کر آئے اور یہی تمہاری سپاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

انهم لهم المنصورون٥ وان جندنا لهم الغلبون٥ (صفت ۱۷۲، ۱۷۳)

ترجمہ! یقیناً ان کی مدد کی جائیگی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہوکر رہیگا۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیوة الدنیا و یوم یقوم الاشهاد٥ (المومن۔۵۱)

ترجمہ! یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانیوالوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہونگے۔

کتب اللہ لا غلبن انا ورسلی۔ (مجادلہ۔۲۱)

ترجمہ: ۔خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

انبیاء کرام عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ

انبیاء کرام ماؤف الدماغ، فاترالعقل نہیں تھے، وہ عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ، انتہائی ذکی، اشیاء کی طبعی خصوصیات اور ان کی توانائی سے بخوبی آشنا تھے، نہ وہ فریب خوردہ تھے، نہ لاعلم، انہیں بخوبی علم تھا کہ جب قوت قوت سے، فوج فوج سے، لوہا لوہے سے، تعداد تعداد سے متصادم ہوتی ہے تو ان میں کمزور کو شکست ہوتی ہے، اور قوی غالب آجاتا ہے۔

جب کسی معرکہ میں صرف مادی قوت پر اعتماد کیا جاتا ہے تو اس میں کمزور کو ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مگر انبیاء کرام اس عرفان کے حامل تھے جو مخفی امور کو پالیتا ہے، اس ہلکی سی کرن کو ان کی دوربین نگاہ دیکھ لیتی ہے، جو ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل رہتی ہے، جسے نصرت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ وہ صاحب بصیرت انسان ہوتے ہیں کہ جن کی کائنات پر گہری نظر ہوتی ہے، اور اللہ کی نصرت پر یہ کلی اعتماد رکھتے ہیں۔

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش

آپ کو فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا وہ واقعہ یاد ہوگا، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں جزیرہ نمائے سینا کی طرف روانہ ہوں (وہی جزیرہ نمائے سینا جس کی یاد ہمارے سوزِ غم کو بڑھا دیتی ہے اور ہمیں خون کے آنسو رُلاتی ہے، ہم نے اپنے ایمان و یقین کو کھونے کی وجہ سے اسے بھی کھودیا) جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ساتھ ساحل سمندر پر پہنچے تو آپ کی قوم بنی اسرائیل کے خوف و ہراسانی کی کوئی انتہا نہیں رہی، چونکہ سامنے سمندر کی غضبناک موجیں تھیں اور پیچھے تعاقب کرتا ہوا فرعون اور اس کا لشکر، وہ چیخ اُٹھے اے موسیٰؑ کیا اسی لئے تو ہمیں یہاں لایا، ہم تو پکڑے گئے"۔

قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ‌ۚ (شعراء۔۶۱)

موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ "ہم تو پکڑے گئے"

ان کا یہ خوف واقعات اور تجربات کی روشنی میں صحیح تھا، اگر فرعون سے بچنے کے لئے وہ سمندر میں کود پڑتے تو ان کا انجام ظاہر تھا، سمندر بغیر کشتی اور جہاز کے پر عافیت گذرگاہ نہیں بنتا، وہ غرق کرنے میں ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم کے درمیان امتیاز نہیں برتا ہے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور تھے، انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر پختہ یقین تھا، اور نورِ نبوت کے ذریعہ انہیں اس کا علم تھا کہ وہ جس اعلیٰ مقصد کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، جس رسالت کا انہیں اعزاز بخشا گیا، وہ اللہ کے نزدیک سمندر کے عمل اور مقصد سے زیادہ

اہم اور لائق احترام ہے، آپ نے پورے اعتماد و یقین سے فرمایا۔

كَلَّا اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِo (الشعراء۔۶۲)

ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔

کیا یہ اعتماد اور یقین اس انسان میں پیدا ہوسکتا ہے جو صرف نیچر پر یقین رکھتا ہو؟ فطرت کے ان آہنی اصولوں پر ہی اس کی نظر ہو جو ظالم و مظلوم میں کوئی فرق نہیں کرتے؟ کیا کسی عام انسان سے یہ ایمانی جملہ ممکن تھا، وہ جملہ جس کی آواز آج تک کانوں میں گونج رہی اور تاریخ میں جس کی بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے، سنئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر۔ فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم o وازلفنا ثم الاخرین o وانجینا موسیٰ ومن معه اجمعین o ثم اغرقنا الاخرین o (الشعراء۔۶۴،۶۳)

ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ "مار اپنا عصا سمندر پر" یکا یک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہوگیا، اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے موسیٰؑ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے ہم نے بچالیا اور دوسروں کو غرق کردیا۔

مشعل راہ

تمام انبیائے کرام اگرچہ اشرف ترین خاندان اور افضل ترین نسب رکھتے ہیں، مگر یہ جانتے ہیں کہ دشمن کے مقابلے میں اعلیٰ نسبی سودمند نہیں، انبیاء تنہا عقل و تجربہ، حواس ظاہری کی کارفرمائی، اپنی طاقت، تنظیم اور تعداد پر اعتماد نہیں کرتے چونکہ ان میں ان کا حریف ان سے بدرجہا فائق ہوتا ہے، بلکہ دونوں کی مادی طاقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، ان حالات میں انہوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا، ایمان کو مشعل راہ بنایا، اپنے پیام، اعلیٰ اخلاق وصفات کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں سے نمایاں اور ممتاز رہے، ان ہی صفات نے ان کے ساتھیوں کو حیرت انگیز درخشانی و تابانی بخشی تھی۔

وہ معرکہ کارزار میں اللہ تعالیٰ کے سہارے قدم رکھتے تھے، ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ سے مدد ونصرت، حق کی فتح، باطل کی ناکامی کی دعائیں جاری رہیں۔

تاریخ ساز واقعہ

معرکہ بدر کو ذہن میں تازہ کیجئے، میدان بدر آپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں، یوم بدر آپ کی تاریخ میں گمنام اور غیر معروف نہیں، غور کیجئے، جب رسول اللہ صلعم ۳۱۳ مہاجرین وانصار کی مختصر جماعت کے ساتھ اس دشمن کے مقابلے کے لئے نکلے تھے جو تعداد، آلات حرب، اسباب وسائل شجاعت وبہادری میں کئی گنا زیادہ اور جوش غضب سے مغلوب تھا۔

آپ نے جب اپنے بے سروسامان ساتھیوں اور دشمنوں کے عظیم لشکر کو دیکھا تو ان دونوں میں کوئی نسبت اور تناسب نہ تھا، اس نازک موقع پر آپ کی سلامتِ فکر فراستِ نبوت اور تجربہ نے یہ محسوس کر لیا کہ ان لمحات میں مسلمانوں کو طبعی قوانین کے حوالے کرنے کے نتیجہ میں ان کی کامیابی تو درکنار مدینہ صحیح سلامت لوٹنے کی توقع تک نہیں کی جاسکتی۔

آپ اپنے رب کی طرف انابت اور دعا کیلئے متوجہ ہوئے، آپ کو بخوبی علم تھا کہ فتح عطیہ الٰہی ہے، طبعی نظام اسی نے بنایا ہے، وہ اسے موقوف بھی کر سکتا ہے، آپ یہ جانتے تھے کہ فیصلہ آسمان سے نازل ہوتا ہے، زمین سے پیدا نہیں ہوتا حکم، قوت اور فتح کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اپ نے اپنی جبین مبارک خاک پر رکھی، الحاح وزاری، عاجزی و درماندگی سے اس طرح دعائیں مانگیں کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے آپ کی حالت دیکھی نہ گئی اور بے چین ہو کر انہوں نے فرمایا کہ:۔

حسبك يا رسول الله بس بس اے اللہ کے رسول۔

دُعا کا پاسنگ

معرکہ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں ہم میں مختلف رنگ و نسل کی مسلمان قومیں، یہ سب بدر کی پروردہ ہیں اور بدر اس دعوت و پیام کا رہین منت ہے جسے آنحضرت صلعم لائے تھے، بدر میں دو مقابل لشکر نہیں تھے، بلکہ دونوں عدد، اسباب ووسائل میں عدم تناسب کے اعتبار سے گویا دو مختلف پلڑے تھے، ایک پلڑا اپنے بوجھ کی

وجہ سے زمین کو چھور ہا تھا، یہ کفار و مشرکین کا پلڑا تھا، دوسرا اپنی بے وزنی کی وجہ سے فضا میں معلق تھا، یہ اہل ایمان کا پلڑا تھا، آنحضرت صلعم نے اپنی دعاؤں اور نصرت الٰہی کا پاسنگ مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔

آپ نے زمین پر اپنی پیشانی رکھی اور وہ جملہ فرمایا جو بلاشبہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کی بقا بلکہ اُمت کی بقا کا حقیقی سبب تھا آپ نے فرمایا:۔

اللهم ان تهلك هذه العصابة لن تعبدo

اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی نصرت فرما کر اس کی تصدیق کی۔

تاریخ میں آج بھی یہ واقعہ زندہ اور اس کے آثار اس دنیا میں تابندہ ہیں، انسانوں کی فلاح و بہبود کی اسی جماعت سے منسلک ہے، جن کی بقا کی دعا میدانِ بدر میں ایک آزمائش کے موقع پر اتنے بلیغ انداز میں پیغمبر اسلام نے کی تھی، دین، اخلاقِ فاضلہ، انصاف، احترام انسانیت کا وجود بدر کی اسی مختصر جماعت کا مرہونِ منت ہے۔

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟

اگر آپ چاہیں تو ان تمام حقائق کو ضائع کردیں۔ اس تمام دولت وثروت کو تلف کردیں، تمام انبیاء کی قربانیوں اور مصلحین کی کوششوں کو مٹادیں تو انسان باقی رہے گا، مگر انسانیت فنا ہو جائے گی، جسم متحرک ہوگا، مگر روح پر موت طاری ہو جائے گی، اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں مسلمانوں کو واضح کامیابی دی، دشمن اپنی قوت وکثرت کے باوجود ناکام رہا، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:۔

ولقد نصركم الله ببدر و انتم ذلة فاتقوا الله لعلكم تشكرون o (آل عمران۔۱۲۳)

آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو اُمید ہے کہ اب تم شکر گذار بنو گے۔

بحر و بر پر حکمرانی

میں آپ کے سامنے ایک دوسرا واقعہ بیان کرتا ہوں حالانکہ میں داستان گوئی کا شائق نہیں، مگر جو واقعہ میں اپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں اس میں ایک پیام ہے، اور نئے معانی پنہاں ہیں، جب سعد بن ابی وقاص مدائن کی فتح کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو دریائے دجلہ میں طغیانی تھی، موجیں اٹھ رہی تھیں ایرانیوں نے تمام پل اور آبی گذرگاہوں کو توڑ دیا تھا، اور کشتیوں اور جہازوں کو دور کر دیا تھا، سعد بن ابی وقاصؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریا کے ساحل پر چند لمحے رک کے غور کیا اور فرمایا ساتھیو! کیا خیال ہے، لوٹ جائیں یا دجلہ میں کود پڑیں اور پار ہو جائیں؟

مسلمان اس دور میں اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، انسانیت کی نجات انہیں کے ذریعہ ممکن ہے، اللہ تعالیٰ انسانیت پر مہربان ہے، اور اس نے انسان کو بیکار نہیں پیدا کیا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ٥ (المومنون ۔۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔

مسلمان یہ جانتے تھے کہ وہ اسلام کے نمائندے، اس کی روشنی کے مینار اور اسلامی دعوت کے مشعل بردار ہیں، وہ دنیا کی تمام قوموں میں واحد جماعت تھی، جو اس مقصد کی خاطر تیار کی گئی تھی، رہا دجلہ تو اس طرح کے ہزاروں دریا ہیں، لہٰذا دجلہ کو یہ کیسے اجازت دی جا سکتی تھی کہ وہ اس لشکر کو غرق کرے جس کی کوئی مادی غرض نہیں، جو جزیرہ عرب سے اس لئے نہیں نکلا کہ ایک تخت کے بجائے دوسرا تخت بچھائے، ایک حکومت کے بجائے دوسری حکومت قائم کرے، ایک بادشاہت کو دوسری بادشاہت میں تبدیل کرے، ایرانیوں سے قیادت و سیادت چھین کر عربوں کو پیش کرے اور کسریٰ کا تاج لے کر اسے عمر (رضی اللہ عنہ) کے سر پر رکھے، یہ باتیں تو مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(اقبال)

ان کی مہم کی غرض یہ رہتی تھی جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا ہے ''اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تا کہ ہم انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف رجوع کریں، دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف لائیں، مذاہب کے ظلم و جبر سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف بلائیں۔''

یہ جان کر اب سوائے اللہ پر اعتماد کے کوئی چارہ نہیں اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا، کہ یہ لشکر باقی رہے اپنے پیام کو پہنچائے اور اپنے دین کو پھیلائے اور لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لے جائے، اور ان پر پڑی ہوئی ظلم وستم کی زنجیروں کو دور کر دے تو اللہ تعالیٰ یقیناً دریائے دجلہ کو اس پہ مامور کرے گا کہ وہ اسلامی لشکر کے لئے راستہ دے دے۔

مومنانہ فراست

حضرت سعدؓ نے اس موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ سے مشورہ کیا انہوں نے جواب دیا، ''بیشک اسلام ایک تازہ پیام ہے'' یہ جملہ میرے قلب وذہن کو بہت متاثر کرتا ہے، کیونکہ اس میں بڑے گہرے معانی مضمر ہیں، اس جواب میں مومن کی ذہانت کا نور جھلکتا ہے، میری مراد عقل عام نہیں بلکہ فراست مومن ہے جسکا یہ جملہ بہترین نمونہ ہے۔

حضرت سلمانؓ نے فرمایا ''بخدا تری ان کیلئے ایسے ہی زیر کر دی جائیگی جیسے خشکی مسخر کی گئی تھی، اس میں سے فوج در فوج لوگ نکلیں گے جیسے فوج در فوج داخل ہوئے''۔ سلمانؓ کے قول کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے چونکہ اسلام نے ابھی تک اپنی مہم پوری نہیں کی اس کے سامنے وسیع میدان ہے، بہت سی قومیں اور قبائل ہیں، متمدن

ممالک ہیں اور یہ پوری دنیا اس دعوت کی منتظر ہے، جس کے وہ حامل ہیں، ان اخلاق وصفات کی منتظر ہے، جن سے یہ آ راستہ ہیں، دنیا اس نجات دہندہ سپاہ کی منتظر ہے، حضرت سلمانؓ نے سچ کہا کہ میری مومنانہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ ہم غرق ہوں گے اور دجلہ ہمیں نگل لے گا، اللہ تعالیٰ اسے ضرور حکم دے گا اور مامور کرے گا کہ وہ ہمارے لئے راہ دے اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ہوا بھی یہی۔

ایمان وعقیدے کا نظام

یہ دو خدائی نظام ہیں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ایک طبعی نظام اقلیت پر اکثریت کا غلبہ، ضعف پر طاقت کا غلبہ، انتشار پر اتحاد کا غلبہ، بدنظمی پر انتظام کا غلبہ، کمزور ارادے پر قوی ارادے کا غلبہ اور کاہلی وجہالت پر علم ومستعدی کا غلبہ، یہ ایک قدیم نظام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور اس کا حکم اور قانون اس وسیع وعریض دنیا اور انسانیت کے بڑے حصہ میں جاری وساری ہے۔

لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک دوسرا نظام بھی ہے وہ ایمان وعقیدے کا نظام، اخلاق وصفات اور دعوت وپیام کا نظام ہے اور یہی وہ سلاح ہے، جس کے ذریعہ مومن جنگ کرتا ہے، اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، یہی وہ ہتھیار ہے، جس کو لے کر عرب، جزیرہ عرب سے نکلے تھے، پھٹے کپڑے، ٹوٹے جوتے، خالی پیٹ اور بغیر زین کے گھوڑوں کے ساتھ، لوگ انہیں حقارت سے دیکھتے اور مذاق اڑاتے اور کہتے ''انہیں ان کے جزیرہ سے بھوک اور برہنگی نے نکالا ہے، انھیں خوب کھلاؤ اور پلاؤ اپنے وطن لوٹ جائیں گے۔''

موجودہ عربوں کی دونوں سے بغاوت

یہ دو خدائی نظام ہیں، لیکن جب کوئی فرد یا جماعت ان دونوں نظاموں کو چھوڑ دیتی ہے، اور ان دونوں سے بغاوت کرتی ہے، یعنی نہ نظام طبعی کے تقاضے پورا کرتی ہے، اور نہ دین واخلاق ہی کے نظام ہی کو اپناتی ہے تو اس کا کیا انجام ہوسکتا ہے؟

آج کے عربوں میں خواہشات کی پیروی، باہمی رزم آرائی، اپنی قومیت پر فخر اور صرف کھوکھلے دعوے اور بلند بانگ نعرے ہیں۔ بے معنی شوروغوغا ہے، بدنظمی و بے تدبیری ہے، کیا ایسا ملک اور ایسی فوج فتح کی مستحق ہوسکتی ہے؟

نسل ونسب

اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان نسب کا کوئی رشتہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وقالت الیھود والنصری نحن ابنواللّٰہ واحیاء ہ، قل فلم یعذبکم بذنوبکم ، بل انتم بشر ممن خلق ط (المائد۔۱۸)

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے چہیتے ہیں ان سے پوچھو پھر وہ تمہارے گناہوں پر کیوں سزا دیتا ہے، درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے۔

خدا کسی انسان کو دوسرے انسان پر، کسی فرد کو دوسرے فرد پر ایک قوم کو دوسری قوم پر، نسب، قومیت، ذات و برادری کی بنیاد پر فضیلت نہیں دیتا، وہ انسانوں کو ان کی دیانت وتقویٰ والی زندگی پر افضل قرار دیتا ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ط(الحجرات۔۱۳)

اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

وہ حبش کے غلام بلالؓ کو قریش کے معزز سردار ابوجہل سے افضل قرار دیتا ہے۔ (جاری)

تاریخ تصوّف

(پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ)

اقتباسات از رسائل جنیدؒ

ہم نے گذشتہ صفحات میں جنیدؒ کے رسائل سے ان کی بنیادی تعلیمات کا خاکہ ہدیہ ناظرین کر دیا ہے لیکن اس خیال سے کہ اس کتاب کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عظیم صوفی کے ارشادات بھی درج کیے جائیں تا کہ تاریخ تصوف کا طالب علم ہر دور کے صوفی کے افکار سے براہ راست آگاہ ہو سکے، ہم ذیل میں رسائل سے دو اقتباس بھی درج کیے دیتے ہیں۔

پہلا اقتباس: من کلام الامام ابی القاسم الجنیدبن محمدقدس الله روحه ونور ضریحه،فی الفرق بین الاخلاص والصدق (یہ ایک خط ہے جو جنیدؒ نے ایک دوست کے اس سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ اخلاص اور صدق میں کیا فرق ہے)۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ۔الحمدللّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

تم نے مجھ سے اخلاص اور صدق میں فرق دریافت کیا ہے۔واضح ہو کہ صدق کا مفہوم ہے فرائض مذہبی ادا کرنے کے بعد اپنے نفس کی حفاظت کرنا اور شدید نگرانی کرنا اور یہ دیکھنا کہ کہیں نفس میں ریا یا کبر تو پیدا نہیں ہو گیا۔(اسی کو محاسبہ بھی کہتے ہیں) تمام مذہبی فرائض کا بجالانا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ بھی مدنظر رہے کہ یہ تعمیل احکام حسن نیت اور سچی عبودیت کے جذبے سے کی جائے (جب تک اللہ سے محبت نہ ہو آدمی میں صدق کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی) اس لئے صدق دراصل انسان کے ارادے کی ایک صفت ہے۔صدق انسان کو نفس امارہ کی پیروی سے روکتا ہے اور اطاعت حق میں غفلت یا سستی سے باز رکھتا ہے۔

صدق، اخلاص پر مقدم ہے اور اخلاص ،صدق کی ایک صفت ہے۔اخلاص بنیادی طور پر ذاتی ارادے سے توحید باری تعالٰی کے اعتراف کا نام ہے اور اس اعتراف کے بعد پھر تمام نواہی

سے اجتناب کرنا ۔ (اگر ایک مسلمان اقرارِ توحید کے بعد خدا کی نافرمانی بھی کرتا ہے تو وہ اپنے اقرار میں مخلص نہیں ہے بلکہ نفاق کے پہلے درجے میں ہے) اخلاص ،صدق سے افضل ہے ۔ اخلاص سے برتر کوئی شے نہیں ہے ۔اخلاص کے بعد صدق کا مرتبہ ہے (اور مومن کیلئے یہ دونوں بہت ضروری ہیں)۔

صدق تین معانی میں مستعمل ہے :۔(۱) صادق بلسانہ (۲) صادق فی فعلہ (۳) صادق بقلبہ ۔صادق فی القول وہ ہے جو ہر حال میں سچ (حق) بولتا ہے ۔اس کی زبان سے کلمہ حق کے علاوہ کچھ نہیں نکل سکتا خواہ وہ اس کے موافق ہو یا مخالف (مثلاً وہ اپنا نقصان گوارا کر لے گا لیکن جھوٹ نہیں بولے گا) صادق وہ ہے جو تاویلات باطلہ اور فریب یا تدلیس سے اجتناب کرتا ہے ۔ صادق فی الفعل وہ ہے جو اپنے ساتھ کوئی نرمی یا رعایت نہیں کرتا ۔جو دوسروں سے کہتا ہے اس پر خود بھی عمل کرتا ہے ۔راستی کے مقابلے میں ذاتی آسائش کو قربان کر دیتا ہے ۔صادق فی النیۃ وہ ہے جو احکام الٰہی کی تعمیل اس لئے کرتا ہے کہ وہ دل سے اللہ کو محبوب رکھتا ہے ۔

اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ دل و جان سے ذاتِ باری تعالیٰ کو اپنی تمام تر توجہاتِ قلبی کا مرکز بنا لے ۔اس کے سوا نہ کسی کو مقصود بنائے نہ مطلوب ٹھہرائے ۔اُسی کی طرف راغب رہے، اُسی کے نام کی مالا جپتا رہے، اسی کا دھیان کرے، اُسی سے لو لگائے ۔اگر دنیا والے اس کی تحقیر کریں تو اس کے اطمینان میں خلل واقع نہ ہو ۔اسے کسی قسم کا رنج و ملال نہ ہو ۔اور اگر دنیا والے اس کی تعریف کریں تو اسے ناگوار ہو، کیونکہ اسے یہ خوف دامن گیر ہو گا کہ مبادا میرے اخلاص میں کمی یا نقص واقع ہو جائے ۔(صادق ،لومۃ لائم اور مدح مادح دونوں سے بے نیاز ہوتا ہے) اخلاص کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مخلص ہے وہ لازماً صادق بھی ہے ۔اور جب ایک شخص مقام صدق حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اخلاص کی نعمت بھی بطورِ فضل عطا فرما دیتا ہے ۔

باب آخر فی التوحید:۔

اعلم ان اول عبادة الله عزوجل معرفته، الخ

جان لو کہ خدا کی عبادت کی پہلی شرط اس کی معرفت ہے اور معرفت کی اصل یہ ہے کہ تم اس بات کا سچے دل سے اقرار کرو کہ وہ واحد لاشریک ہے اور اس کی احدیت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے بارے میں ان سوالات کے جوابات کے امکان کی مکمل نفی کر دو۔ مثلاً وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیونکر ہے؟ کہاں ہے؟ کب سے ہے؟۔

ہم صرف خدا ہی کی مدد اور توفیق سے اس کی طرف راہ پا سکتے ہیں۔ جب توفیق ایزدی کسی بندے کے شامل حال ہوتی ہے تو اسے توحید کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے اور جب بندے کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کے احکام کی دل و جان سے اتباع کرنے لگتا ہے۔ اس اتباع سے اسے بارگاہ ایزدی میں قرب حاصل ہوتا ہے اور قرب کا ثمرہ مشاہدہ ہے اور جب سالک ذات باری کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کی ذاتی ہستی اس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح آفتاب طلوع ہوتا ہے تو ستارے معدوم یا کالعدم ہو جاتے ہیں اسی طرح جب ذات ایزدی کا آفتاب قلب سالک کے افق پر طلوع ہوتا ہے تو اس کا انفرادی وجود فنا ہو جاتا ہے (اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ در حقیقت اللہ کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں ہے) اُس کی انفرادی ہستی کی فناء کے بعد اس کی روحانی ہستی کامل طور پر مصفّٰی ہو جاتی ہے اور جب یہ صورت ہوتی ہے تو اس کے اوصاف شخصی یا نفس کے تقاضے سب زائل ہو جاتے ہیں اور اسے حضوری کاملہ نصیب ہو جاتی ہے۔ جب وہ پورے طور پر اللہ کے حضور میں زندگی بسر کرتا ہے تو اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس پر غائب و حضور دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ وہ حاضر بھی ہوتا ہے، غائب بھی ہوتا ہے، (نفس کے اعتبار سے مردہ ہوتا ہے، روح کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے) جہاں وہ نہیں ہے وہاں وہ موجود ہوتا ہے اور جہاں وہ ہے وہاں موجود نہیں ہوتا۔ خدا کی ذات میں موجود ہو کر

اور اپنی ذات میں (یا اپنی ذات کے اعتبار سے) معدوم ہو کر وہ خدا کی ذات میں (خدا کے ساتھ) بھی موجود ہوتا ہے اور اپنی ذات میں بھی موجود ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ اپنے نفس پر موت وارد کرتا ہے، پھر اللہ اُسے دوبارہ حیاتِ نو عطا کرتا ہے اور فناء فی اللہ ہونے کے بعد بقاء باللہ کا تاج اس کے سر پر دھرا جاتا ہے۔ یعنی وہ دوبارہ انسانی صفات سے متصف ہو کر عوام الناس کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے۔

مسلۃ اُخریٰ (دوسرا مسئلہ)

اعلم انك محجوب عنك بك الخ

جان لو کہ تم خود اپنا حجاب ہو جو تمہیں تم سے پوشیدہ کر رہا ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ تم خود خدا تک نہیں پہنچ سکتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ جب خدا تمہیں خود اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھاتا ہے تو گویا وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ اُس تک پہنچو اور جب وہ خود تمہیں اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو تم لازمی طور سے اس تک پہنچنے کی سعی کرو گے۔ اس منزل پر پہنچ کر تمہارے اندر جستجو کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور تم وہ اعمال بجا لاتے ہو جن کی بدولت خدا رسی کی راہیں تم پر کھولی جاتی ہیں۔ پس خدا تمہاری کامیابی کی خاطر تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم فناء فی اللہ ہو کر ابدی زندگی حاصل کر لیتے ہو۔

جان لو کہ آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک قسم ان کی جو خدا کی جستجو کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی جو اس کے دروازے تک پہنچ کر وہاں مقیم ہو جاتے ہیں۔ تیسری قسم ان کی جو اندر داخل ہو کر وہاں مقیم ہو جاتے ہیں۔

جنیدؒ سے سوال کیا گیا کہ اہلِ معرفت کی عبادت کا منتہٰی کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے نفوس پر کامل فتح و ظفر حاصل کرنا۔

حرب اسلامی اور دفاع پاکستان
غزوۂ فتح مکہ (رمضان المبارک ۸ ہجری)

(کرنل فضل ربی)

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا o

اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو کھلی فتح عطاء کی۔

صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں قبائل عرب میں سے بنوخزاعہ مسلمانوں کا حلیف بن گیا تھا جبکہ قبیلہ بنو بکر نے قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔معاہدہ حدیبیہ کے بعد بنو بکر نے امن کی فضا کو غنیمت سمجھ کر پرانی عداوت کے پیش نظر بنوخزاعہ پر شب خون مارا۔قریش مکہ نے معاہدہ کی پرواہ کئے بغیر بنو بکر کی مدد کی۔کئی سرداروں نے شکلیں تبدیل کر کے رات کے وقت بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں اور اسلحے سے اِنکی مدد کی۔بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی مگر وہاں بھی اِن کو نہ چھوڑا گیا۔بنو خزاعہ کے لوگ فریادی بن کر مدینہ منور میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔حضور ﷺ نہایت رنجیدہ ہو گئے۔اور اپنا قاصد تین شرائط کے ساتھ قریش مکہ کے پاس بھیجا۔یہ شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔

(۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ختم ہو چکا ہے۔

قریش نے عجلت سے کام لیکر قرطہ بن عمرو کی زبانی تیسری شرط منظور کی لیکن قاصد کے جانے کے بعد پشیمان ہوئے اور ابو سفیان کو فوراً مدینہ منورہ معاہدہ کی تجدید کیلئے روانہ کیا۔نبی کریم ﷺ نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا۔۱۰ رمضان المبارک ۸ ہجری کو دس یا بارہ ہزار سپاہ کا لشکر لے کر آپؐ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔

دشمن نے مقابلہ نہ کرنے میں خیریت سمجھی۔معمولی جھڑپوں اور رکاوٹوں کو ہٹانے کے بعد مکہ فتح ہوا۔نبی کریم ﷺ فاتحانہ انداز کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اعلان کیا کہ اگر کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے،حرم میں پناہ لے،اِس کو امن ہے۔

نبی کریمؐ نے خانہ کعبہ کو تمام بتوں سے پاک کیا اور عام معافی کا اعلان اِن الفاظ میں کیا۔

فَاِنِّی اَقُوْلُ کَمَا قَالَ اَخِیْ یُوْسُفُ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَکُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔

پس میں اپنے برادر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح کہتا ہوں آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے وہ سب سے بڑا ارحم کرنے والا ہے۔

فتح مکہ کے دوران نبی کریم ﷺ نے جو دفاعی تدابیر اختیار کیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

<u>راز داری</u> فتح مکہ کیلئے تیاری کا حکم دیا گیا۔ غزوہ کیلئے مقدور بھر سامانِ حرب کی فراہمی کا اعلان کیا گیا۔ اِن اعلانات کے باوجود نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ کہ کس طرف کوچ (MOVE) کی جائے گی۔ حتیٰ کہ حضرت ابو بکرؓ و ازواج مطہرات کو اِس کا پتہ نہ تھا۔ جب کہ انہیں سامان باندھنے اور دیگر تیاری کا حکم مل چکا تھا۔ عین وقت پر نبی کریم ﷺ نے مکہ جانے کا اعلان کیا اور ساتھ یہ دُعا بھی کی۔

اَللّٰهُمَّ خُذِ الْعُیُوْنَ وَالْاَخْبَارَ عَنْ قُرَیْش حَتّٰی نَبْغَتَهَا فِیْ بِلَادِهَا۔

اے اللہ آنکھوں اور خبروں کو قریش سے پکڑ لے یعنی نہ قریش کو ہماری تیاری کی خبر ہو اور نہ وہ ہماری تیاری کو دیکھ ہی سکیں۔ یہاں تک کہ ہم اِن کے بلاد پر اچانک حملہ آور ہو جائیں۔

عین وقت پر نبی کریم ﷺ نے قلب لشکر (CENTRE) کو سمت وغیرہ سے اِس لئے آگاہ کر دیا کہ اِس وقت یہ انکشاف ناگزیر تھا۔ اتنی احتیاط کے باوجود نبی کریمؐ نے چاروں طرف جاسوس روانہ کئے لہٰذا مدینہ منورہ سے حاطب بن ابی بلتعہ بدری کی طرف سے ایک مشرک عورت کے ہاتھ فوجی رازوں کو فاش کرنے سے متعلق خط کو حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ نے راستے میں پکڑ لیا۔

دس ہزار کے اِس لشکر کو نبی کریم ﷺ نے نہایت رازداری کے ساتھ غیر معروف راستے سے بالکل مکہ کے نزدیک مرالظہران تک پہنچا دیا۔

<u>نفسیاتی دباؤ</u> مرالظہران پہنچ کر نبی کریم نے پڑاؤ (CAMP) ڈال دیا۔ تمام سپاہ کو حکم دیا کہ ہر سپاہی اپنے لئے علیحدہ علیحدہ آگ روشن کرے۔ تا کہ دشمن پر مسلمانوں کی تعداد زیادہ ظاہر ہو جائے ابو سفیان نے جب دس ہزار چولہوں کو روشن دیکھا تو تحقیق کی غرض سے باہر نکلا۔

اور مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہوکر اسلام قبول کیا۔حضرت عباسؓ نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے ابوسفیان کو ایک ٹیکری پر بٹھادیا اور تمام فوج کو اِس کے سامنے سے گزرنے کا حکم دیا۔اِن مظاہروں کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قیادت کو مرغوب کیا جائے۔اور یوں طاقت کے اِستعمال اور خون ریزی کے بغیر محض نفسیاتی محاذ سے دشمن کو شکست دی جائے۔

نظم وضبط غزوہ فتح مکہ میں شامل سپاہ کا تعلق مختلف قبائل سے تھا۔مہاجرین اور انصار کے علاوہ آٹھ مختلف قبائل کی سپاہ اِس لشکر میں موجود تھے۔تمام قبائل کی فوج نے ایک خاص سمت (Specific Direction) سے داخلہ اور نکاس کر کے ایک ہی مرکز اجتاعی (FOCAL POINT) پر بغیر کسی خون ریزی اور نقصان کے پہنچنا تھا۔لہٰذا جیسے حضرت سعد بن عبادہ نے اپنی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے کہا کہ آج یوم الملحمۃ (جنگ کا دن) ہے تو نبی کریم ﷺ نے نشان لیکر حضرت علیؓ کو دیا۔اور فرمایا الیوم یوم المرحمۃ (آج کا دن رحم کا ہے) انصار، مہاجرین اور قبائل کے دستے اپنے اپنے علم لئے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے ایسے کمال ترتیب کے ساتھ گزر کر جبل ہند پر مجتمع ہو گئے کہ ایک طرف تو سارے مکہ کو محاصرے میں لیا گیا تو دوسری طرف کسی قسم کی خونریزی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

رسد ورسائل کی فراوانی فتح مکہ کے دوران دس ہزار سپاہ کے لئے بہتر انتظامات کئے گئے تھے۔ اکثریت کو سواری حاصل تھی اسلحہ سب کے پاس تھا۔ زرہیں، خود(HELMET)خصوصاً انصار و مہاجرین کے لشکر کے پاس اتنی تھی کہ اکثر سپاہ کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔سامان خورد ونوش بھی کافی تھا۔اِس لئے مسلمان سپاہ ہر قسم کے اِنتظامی امور(LOGISTIC MATTERS) سے بے نیاز ہوکر جوش وخروش اور یک سوئی کے ساتھ مہم میں شریک تھے۔

دفاعی حکمت عملی(DEFENCE STRATEGY)

مکہ میں داخلہ کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا کہ جو شخص گھر کا دروازہ بند کرے،ابوسفیان کے گھر پناہ لے یا حرم میں داخل ہو اس کو امن ہے۔

امن کے لیے مخصوص کیے گئے مقامات کے اعلان سے مندرجہ ذیل دو فائدے بھی سامنے آئے۔

ا۔ ہتھیار رکھنے والوں (SURRENDERS) اور مزاحمت کرنے والوں میں امتیاز ہو گیا۔
ب۔ دشمن کی قوت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرکز کی جگہ تین مقامات میں تقسیم کیا۔ جس سے دشمن منتشر ہو کر متفقہ طور پر مدافعت کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ مسلم کی روایت ہے۔

عَنْ عَبْدُاللّٰهِ بِنِ رَبَاحٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ دَخَلَ دَارَا اَبِیْ سُفْیَانْ فَھُوَا مِنَ وَمَنْ اَلْقٰی السّلَاح فَھُوَ اٰمِنَ وَمَنْ اَغْلَقَ بَابَهُ فَھُوَا مِنَ۔

عبداللہ بن رباحؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی ابوسفیان کے گھر چلا جائے اِس کو امن ہے اور جو ہتھیار ڈال دے اس کو امن ہے اور جو کوئی دروازہ بند کر دے اِس کو امن ہے۔

<u>عفوو درگزر</u> نبی کریم ﷺ لشکر جرار کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے۔ وہی شہر جہاں سے آٹھ سال قبل نبی کریم ﷺ نہایت کسمپرسی کی حالت میں نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ آج وہ شہر فتح ہوا۔ اکیس سال تک نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے نظام حیات کو قبول کرنے والوں کو اذیتیں دینے والے سامنے موجود تھے۔ یہ دشمن ایسے قابو میں تھے کہ نبی کریم ﷺ کے ایک اشارے سے اِن کے سرتن سے الگ کیے جا سکتے تھے۔ مگر اتنی طاقت اور خوشی حاصل کرنے کے باوجود آپ (ﷺ) نے کوئی جشن نہیں منایا، نہ کسی پر ہاتھ اُٹھایا (ماسوائے چند شریروں کے) بلکہ ہدایت فرمائی:۔

☆۔ نہ کوئی زخمی مارا جائے۔
☆۔ نہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے۔
☆۔ نہ کوئی قیدی قتل کیا جائے۔
☆۔ اور جو کوئی اپنا دروازہ بند کرے وہ امن میں ہے۔

اِسی طرح نبی کریم ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو جنہوں نے مسلمان ہو کر بھی کسی مجبوری کے تحت قریش کے لئے جاسوسی کی تھی۔ اِسی غزوہ کے موقع پر معاف فرمایا۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

(مولانا وحیدالدین خاں)

فریڈرش انگلس نے کہا ہے۔۔۔''آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہئے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ و سیاست کے مسائل پر غور کرسکتا ہے''۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے کہ ''میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی''۔ یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آ گیا ہوں، ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے، مگر انسان بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں، کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردعمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا، اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری مگر جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہوگئی، اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتا ہے:

''میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے، جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں، میں تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کرسکتا، میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آ رہا ہے، میری آنکھیں رو رہی ہیں،

لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندہ درگار نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا، جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متمنی ہوں، اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے، یہ روح القدس کی جھلک ہے، اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔''

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں ابھرا تھا، مگر اس کو تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے، ''خدا میرا خالق ہے'' ''اور میں اس کا بندہ ہوں'' یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے، ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے، اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا، اسے پالے، اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پا لینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا، تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کیلئے تڑپ رہے تھے یہ آنسو دراصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا۔ یہ اپنے معبود کو پا لینے کی خوشی تھی، جس کیلئے انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا، اسی طرح ایک لیڈر جب ''قوم کے باپ'' کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے، اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کیلئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے، ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے اور اس

کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔

مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں، اور **ان الشرك لظلم عظیم** (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا، گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کیلئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے، اس لئے ابتداً وہ ہمیشہ فطری شکل میں اُبھرتا ہے، اس کا پہلا رُخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے، مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے، برٹ رنیڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا، وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا۔ ''تمہاری پسندیدہ دعا کونسی ہے'' چھوٹے رسل نے جواب دیا ''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں'' اس زمانے میں خدا برٹ رنیڈ رسل کا معبود تھا۔ لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات اُبھرنے لگے، اور اب برٹ رینڈ رسل ایک ملحد انسان تھے جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ ہیں ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے، بی، بی، سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا۔۔۔ ''کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟ رسل نے جواب دیا

''جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہمکنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ابدی دنیا تھی وقت کی قید سے آزاد دنیا، مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا''۔

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا، مگر معبود سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا، اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا، وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا اور صرف یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کیلئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔ ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو در اصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

''نہرو رکوع میں''۔۔۔ اگر یہ خبر کسی دن اخبار میں چھپے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ واقعہ ہے، لیکن ہندوستان ٹائمس (دہلی) کی ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تصویر اس کی تصدیق کر رہی ہے، اس تصویر میں نظر آ رہا ہے کہ ہندوستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو دو زانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر رکوع کی مانند جھکے ہوئے ہیں، یہ گاندھی جینتی کے موقع کی تصویر ہے اور نہرو راج گھاٹ میں گاندھی کی سمادھی پر قوم کے باپو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہر سال اور ہر روز ساری دنیا میں ہوتے ہیں، لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ''الٰہ'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا، کیونکہ ''الٰہ'' کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پر نہیں کر سکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں، جیسے کوئی بے بچہ کی

ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبالے اوراس سے تسکین حاصل کرنا چاہئے ۔ ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انہوں نے لکھا:۔

''میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہوگیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا، کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں''۔(NEHRU- AUTOBIOGRAPHY (LONDON 1953 P.597)

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیراعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلاشرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا۔ جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے، جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیسٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

''میں ایک سیاستداں ہوں اور مجھے سوچنے کیلئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں''۔(National Herald, Jan.6 1964)

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا ہوا ہے جنہوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں

عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہمکنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انہیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دنیوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چند روزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے، یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں، جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ہولناک زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے، جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے، اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے جس میں اس کی روح کو بالآخر مبتلا ہونا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس جہنم کا دھواں ہے جو ہر کافر و مشرک کے لئے تیار کی گئی ہے۔ گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئے آدمی کے دماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ دھوئیں کی گھٹن سے جاگ گیا تو اپنے آپ کو بچالے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری بے حسی اور بے خبری نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہو جائے، کیونکہ بیداری وہی ہے، جو وقت سے پہلے ہو، وقت ختم ہونے پر بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲۔ میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (MICHAEL BRECHER) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے، اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی، نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ جون ۱۹۵۶ء کو انہوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا۔

''آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کیلئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفہ زندگی کیا ہے''؟۔

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:۔

''میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار(Moral Standards) کہہ لیجئے یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کیلئے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم، ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔

(NEHRU: A POLITICAL BIOGRAPHY(LONDON, 1959)Pl.607-8)

یہ سوال وجواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت واخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے، پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ(COURTESY WEEK) منایا جاتا ہے، مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کیلئے ''اخلاق'' کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے، بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کیلئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ ''بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے''۔(Ticketless Travel Social Evil) مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو جرم سے باز رکھے، تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کردی جاتی ہے۔۔۔''رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے'' مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انہیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار زور شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں،

ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں۔۔ ''ریلوے قوم کی ملکیت ہے، اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے'' مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں، اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ''قوم'' کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے ''اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کیلئے استعمال کرنا ملک وقوم سے غداری ہے'' ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے، اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود معیاروں سے محروم ہو گئی ہے جو قومی تعمیر کیلئے ضروری ہیں، اوران معیاروں کو پیدا کرنے کیلئے جتنے ذرائع استعمال کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لاکر ڈال دیا ہے، اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے، جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے، زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادوبان ہو گئی ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کیلئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے، یہی وہ تنہا بنیاد ہے، جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چیسٹر باؤلز (Chester Bowles) لکھتے ہیں۔

''زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دوچار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں، ایک یہ کہ سرمایہ، خام اشیاء اور فنی مہارت جو انہیں حاصل ہیں ان کو کسی طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں۔

دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور ادارہ سے ہے، صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ تیقن بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ جتنی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ

خرابیاں پیدا نہ کردے، مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہوسکتی ہیں، اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے"۔

(The Making of A Just Society (Delhi 1963) PP. 68-69)

باولز کے الفاظ میں عوام گویا وہ ماحول ہیں، جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں، ترقی کے ضروری سامان ۔۔۔ سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتے۔ (ص ۳۱)

یہ خلا کیسے پر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانتداری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہوسکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار رہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اسی کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ ۔۔۔ "انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے" تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کرتے ہیں، وہ پوری سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہورہے ہیں۔ (جاری)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف وکرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت رواصرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد واذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چار دیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

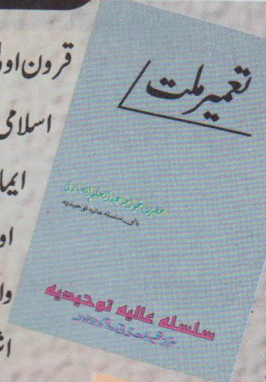
6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب ونظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوکر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اِس میں غرق ہوجانے کی۔

Monthly **FALAH-E-ADMIYYAT**

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



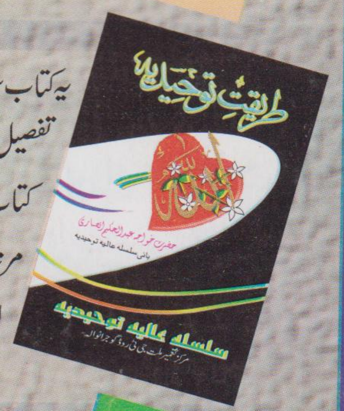
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔

سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔

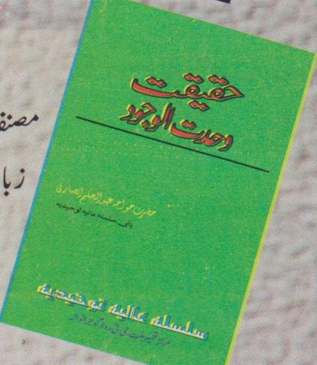
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔

تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔

مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

Website: www.toheedia.net